دسمبر 2003

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

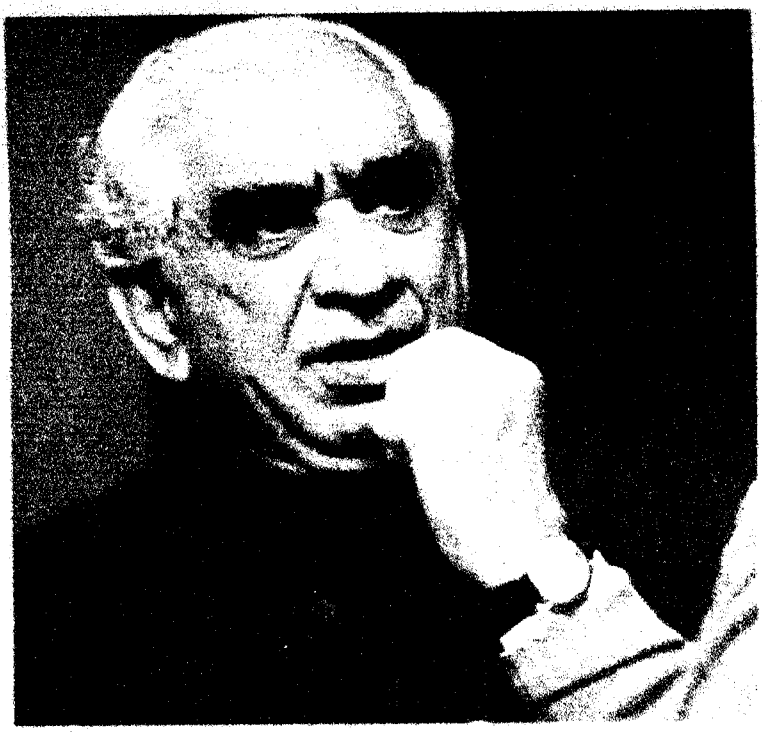

قومی اردو کونسل کے ایک سالہ ڈپلوما کورس اِن اردو لینگویج کے نئے طالب علم

شری جسونت سنگھ
مرکزی وزیرِ خزانہ، حکومتِ ہند

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
محکمہ ثانوی و اعلا تعلیم، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

ریاستی مدرسہ بورڈوں کے سربراہان اور اعلا افسران کی ایک میٹنگ 29 ستمبر 2003 کو قومی اردو کونسل کے کمیٹی روم میں منعقد ہوئی جس میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ،
جناب مدھوکر سنہا (ڈپٹی سکریٹری، وزارت ترقی انسانی وسائل) جناب پی. این گپتا (اسسٹنٹ ڈائرکٹر (ایم) وزارت ترقی انسانی وسائل)، پروفیسر عبدالواحد انصاری
(چیئرمین بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ)، جناب علاء الدین آزاد (چیئرمین، راجستھان مدرسہ بورڈ)، جناب محمد حنیف (سکریٹری، مدھیہ پردیش مدرسہ بورڈ)، جناب سید عطامی الدین
(اسپیشل انسپکٹنگ آفیسر، اڑیسہ اسٹیٹ بورڈ آف مدرسہ بورڈ)، ڈاکٹر جگتار سنگھ (ڈی. پی. آئی. (ای. ای.) محکمۂ تعلیم، حکومتِ پنجاب)، جناب اطہر خاں (سینئر اسسٹنٹ محکمۂ تعلیم، حکومت اتر پردیش)،
جناب طمن چندر مجمدار (ڈپٹی ڈائرکٹر آف اسکول ایجوکیشن، حکومت تریپورہ)، جناب ایم. اے. قدوس خاں، (ایس آئی (اردو) حکومت منی پور)، ڈاکٹر آر. کے. بھٹ
(پرنسپل پبلیکیشن آفیسر، قومی اردو کونسل) اور ڈاکٹر ارشد اقبال (قومی اردو کونسل) نے شرکت کی۔ اس موقعے پر لی گئی ایک تصویر۔

سرینگر میں منعقدہ چوتھے کل ہند اردو کتاب میلے کے دوران جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگوئجز، سری نگر کے زیر اہتمام منعقدہ نمائش خطاطی و تقریب تقسیم انعامات و اعزازات کا افتتاح کرتے
ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ۔ ساتھ میں آئی. جی. پی سینٹرل جاوید مخدومی اور جناب اے. آر. قاری کو دیکھا جا سکتا ہے۔

ماہنامہ
اردو دُنیا نئی دہلی

جلد۔5، شمارہ۔12 دسمبر 2003

مدیر: ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

معاون مدیر: ارجمند آرا

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ ثانوی و اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: قومی اُردو کونسل

مطبع: جے کے آفسیٹ پرنٹرس، جامع مسجد، دہلی 6

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اُردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

چیک یا ڈرافٹ NCPUL کے نام روانہ کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ۔6
آر۔کے۔پورم نئی دہلی - 066 110
فون: 26103381, 26103938
فیکس: 26179657 26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urducoun@ndf.vsnl.net.in

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر۔کے۔پورم نئی دہلی۔ 110066
فون: 26109746

شاخ: 20/435/4-4-5، گرین ہاؤس،
اسٹیشن روڈ، نام پلی، حیدرآباد 500001 (A.P.)
فون: 24615139

اس شمارے میں

آپ کی بات .... خطوط 2
ہماری بات .... اداریہ 5
- تعلیم برائے ترقی (گیسٹ کالم) .... من موہن سنگھ 6
- اردو ہماری اپنی زبان ہے ــ جسونت سنگھ .... انبساط احمد علوی/نفیس احمد 9
- مولانا ابوالکلام آزاد اور سیکولرزم .... مخمور سعیدی 11
- درسی کتب اور فرہنگ .... انجمن آرا انجم 16
- طلبہ میں ذوقِ مطالعہ کا فروغ .... حمید اللہ صدیقی 19
- ادیب اور عہدِ حاضر کے مسائل .... احمد طارق 21
- اخباری تحریر کی خصوصیات .... شاہد حسین 23
- ندی ربط سازی کا منصوبہ .... معین الدین خاں 25
- کتابوں کی دنیا سے بچوں کی شناسائی .... دی. ایم موہن راج 29
- حقیقی آزادی اور عام سائنس .... ہریش اگروال 31
- چھوٹی فصلیں اور سرکاری امداد .... بھرت جھن جھن والا 33

گوشۂ ادب:
- سفید فام کرداروں کی خودسوزیاں .... ہریش ترویدی 35
- دنیا میں جہاں بھی جاتا ہوں ------ .... ایڈورڈ سعید 37
- حسین الحق سے گفتگو .... شہاب ظفر اعظمی 39

گوشۂ فروغ کتب
- لغت اور استعمالِ عام ("زبان اور قواعد" سے اقتباس) .... رشید حسن خاں 44
- یونانی اور آیورویدک ------ ("تاریخِ طب" سے اقتباس) .... حکیم سید محمد حسان نگرامی 46

طلبہ کے لیے
- قومی مشترکہ انٹرنس ٹسٹ (NEST) (کیریئر گائیڈنس) .... سلمان عابد 49
- انٹرنیٹ گائیڈ .... نعیم احسن 50
- لائبریری اینڈ انفارمیشن سائنس (کورَز) .... محمد سہیم الدین ندوی 53
- بڑھتے قدم (کمپیوٹر سینٹر کے فارغ طلبہ کے انٹرویو-5) .... فیروز عالم 56

اُردو خبرنامہ .... ادارہ 57
تبصرہ و تعارف .... کتابوں پر تبصرے 70
- انیس کے سلام/علی جواد زیدی .... مبصر: احمد کفیل
- ہندستان کے زمانۂ قدیم و وسطیٰ کے کتب خانے/بمل کمار دت .... مبصر: محمد سہیم الدین ندوی
- اردو شاعری: انتخاب/ڈاکٹر خورشید عالم، ڈاکٹر دسیم بیگم .... مبصر: پرویز احمد اعظمی
- دی وار جرنلس/صلاح الدین پرویز .... مبصر: فیروز عالم
- گل دستہ (حصہ اوّل تا چہارم)/پروفیسر محمد زماں آزردہ .... مبصر: کلیم اللہ
- عرفان عباسی۔ حیات و خدمات/عبدالحنان سیوانی ندوی
- سید حرمت الاکرام: حیات و خدمات/ڈاکٹر ایس. جی. آئی. حیدر

بچوں کا گوشہ
- انسانی روبوٹ .... ایرا سکینہ 74

آپ کی بات

■ **پروفیسر جگن ناتھ آزاد، A-25، گورنمنٹ کوارٹرس، گاندھی نگر، جموں توی، جموں اینڈ کشمیر**

علی محمد خسرو صاحب کے انتقال پُر ملال کی خبر سے مجھ پر گویا بجلی سی گری۔ ابھی حال ہی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سمینار میں ان سے ملاقات ہوئی۔ ان سے راقم التحریر کے رسمی مراسم ہی نہیں تھے بلکہ وہ میرے محسن تھے۔ خداوند کریم انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ میں تو ایک ذرۂ ناچیز ہوں، اگر ہم غور سے دیکھیں تو وہ سارے ہندستان کے محسن تھے۔ وہ صحیح معنوں میں ایک سیکولر شخصیت تھے۔ ماہنامہ "اردو دنیا" نے انھیں یاد رکھا، یہ آپ کا اردو زبان پر احسان ہے۔ میں ان کے بارے میں ایک مضمون لکھنا چاہتا تھا لیکن بر بنائے علالت معذور ہوں۔ ڈاکٹر نے لکھنے پڑھنے سے منع کر رکھا ہے۔ ان کی حکم عدولی کرتے ہوئے کوئی نہ کوئی خط تو لکھ ہی لیتا ہوں لیکن مضمون لکھنے کے لیے جم کے بیٹھنا پڑتا ہے اور میں چند سطور لکھ کے تھک جاتا ہوں۔

■ **آر۔ کے۔ اروڑا، ایگزیکیٹیو ڈائرکٹر، سینٹر فار ڈیولپمنٹ آف ایڈوانسڈ کمپیوٹنگ، پونے یونیورسٹی کیمپس، پونے-411007**

C-DAC میں اپنی پانچ سالہ مدّت کار ختم ہونے کے بعد میں پھر سے اپنے پرانے ادارے میں واپس لوٹ رہا ہوں۔ C-DAC میں گزرا ہوا عرصہ جوش، چیلنج اور کامیابی سے بھرپور تھا۔ اس سے مجھے ترقی یافتہ انفارمیشن ٹیکنالوجی میں ریسرچ اور ڈیولپمنٹ کی مساعی اور دیگر کاموں کے ضمن میں زبردست تجربے حاصل ہوئے۔

اس ادارے میں رہتے ہوئے مجھے آپ سے جو تعاون حاصل ہوا، اس کے لیے میں تہہ دل سے آپ کا مشکور ہوں۔ مجھے امید ہے کہ مستقبل میں بھی آپ کی رہنمائی اور تعاون مجھے حاصل ہوتا رہے گا۔

■ **انظر شاہ مسعودی، بیت الحکمت، دیوبند-447554، یوپی**

آپ کی مصروفیات بذریعۂ اخبار معلوم ہوتی رہتی ہیں، کشمیر میں آپ کی تازہ سرگرمیاں اور اس کو regain کرنے کی کوششیں لائقِ ستائش ہیں، خدا کرے کہ آپ کی مساعی بارآور ہوں۔

■ **سہیل انور، جواہر لال نہرو یونیورسٹی**

(قومی آواز (10/نومبر2003) میں جناب سہیل انور کا خط شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے اردو اور اردو والوں سے متعلق اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کیا ہے اور اردو والوں کو اردو کا رونا ترک کرکے فروغ اردو کے لیے سنجیدگی سے کوشش کرنے کی دعوت دی ہے۔ خط کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے "قومی آواز" کے شکریے کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے۔)

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

میں جب بھی سیمناروں اور مشاعروں میں جاتا ہوں اکثر پیغام آفاقی سے میر کا مذکورہ شعر سنتا ہوں جو ڈپٹی کمشنر آف پولیس (دہلی) ہیں اور اردو کے باذوق شاعر بھی۔ آفاقی صاحب لفظ نازک اور کارگہِ شیشہ گری پر بہت زور ڈالتے ہیں۔ اسی طرح جیسے کسی کو شیشے کی کلہاڑی دے دی جائے اور جوئے شیر لانے کے لیے کہا جائے۔ ممکن ہے وہ اس شعر کے حوالے سے حالات کی نزاکت اور شب و روز کے نشیب و فراز کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتے ہوں۔ میر نے یہ شعر غالباً اپنے زمانے کے سیاسی اتھل پتھل اور زوال و انحطاط پذیر معاشرے کے ضمن میں کہا تھا۔ برطانوی حکومت کے دور میں مسلمانوں کو ان حالات سے بھی گزرنا پڑا تھا جس میں عرصۂ حیات بھی تنگ ہوتا جارہا تھا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح کمشنر صاحب کو اپنے انتظام و انصرام میں باریکی اور کارگہِ شیشہ گری کے استعارے سے کام لینا ہوتا ہے اسی طرح ہم اردو والوں کو بھی رونا دھونا اور ہائے اردو وائے اردو کا ماتم چھوڑ کر عملی میدان میں آنا ہوگا۔ البتہ عملی میدان میں اترنے میں بہت ساری دشواریوں اور حوادث کا سامنا بھی کرنا پڑ سکتا ہے۔ اب اردو کا رونا دھونا کب تک؟ اس کی بدحالی اور زبوں حالی پر زبانی جمع خرچ کرنا کب تک؟ یاد رکھیے، جب کسی زبان اور قوم پر دشواریاں آتی ہیں تبھی آسانیاں بھی اپنی راہیں ہموار کرلیتی ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ حکمرانوں پر الزام تراشی کرنا چھوڑ دیں کیونکہ ہمیں یہ جان کر شرمندگی اور ندامت ہوگی کہ اہلِ زبان اردو سے زیادہ اردو کی خیرخواہی غیراردو والوں نے کی ہے اور اس کی حمایت میں 'مرن برت' تک رکھا ہے اور اردو پر اپنی جان نچھاور کی ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی واجب ہے کہ شری شیام منگل پانڈے جیسے اردو کے شیدائیوں کی قربانی بھی یاد رکھی جائے جنھوں نے اردو کے جائز آئینی حق کے لیے مرن برت رکھا اور آخرکار اسی مرن برت کے دوران جان دی۔ اردو والوں کی طرف سے یہ پہلی قربانی تھی اور کیسے مجاہد حوصلہ مند مجاہد کی قربانی، جس نے قوم اور ملک کے ضمیر کو بیدار کرنے کی خاطر اپنی جان دی۔

اب ہم اردو کی روٹی توڑنے والے حضرات ذرا اپنا محاسبہ کرلیں کہ ہم اردو

کے فروغ کے تئیں کس قدر سنجیدہ ہیں۔

دہلی میں مرکزی حکومت کا ایک فعال ادارہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سرگرم عمل ہے۔ 28 رفروری 2003 کو سہ روزہ بین الاقوامی سمینار انجمن ترقی اردو کی صد سالہ تقریب میں منعقد کیا گیا تھا۔ اس کے افتتاحی اجلاس میں بولتے ہوئے سید شاہد مہدی (وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے اپنے تعارفی کلمات میں کہا تھا کہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ ایک ایسے کنویں کی مانند ہیں جو خود چل کر پیاسے کے پاس جاتا ہے لیکن بڑے حیرت اور افسوس کی بات ہے کہ جب وہ دو روزہ اردو انٹرنیشنل کانفرنس میں خطاب کر رہے تھے تو شاید وہ اردو والوں کی بے راہ روی، بدنیتی اور بد دیانتی سے تنگ آکر اردو کے تعلق سے مایوس نظر آرہے تھے۔ سوال ذہن میں اٹھتا ہے کہ آخر ایسا کیوں؟ سرسید بھی اگر اسی طرح مایوس ہو گئے ہوتے تو کیا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام آج عمل میں آیا ہوتا؟ ہرگز نہیں۔

یہ باتیں روز روشن کی طرح عیاں ہیں کہ کوئی بھی تحریک یا مشن اپنے ابتدائی مرحلے میں بہت دشواریوں، رکاوٹوں اور مخالفتوں سے دوچار ہوتا ہے لیکن جب یہ اپنے مشن پر ثابت قدم رہتا ہے تو پھر ان کوششوں اور تحریکوں کے بارآور ہونے میں کوئی رخنہ نہیں پڑتا اور یہ بلا روک ٹوک منزل مقصود پر گامزن رہتی ہیں۔

اردو کو دہلی میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیے جانے کے بعد اردو والے ابھی تک استقبالیہ، سمینار، سمپوزیم منعقد کروانے میں ہی منہمک ہیں اور داد وتحسین کے متمنی ہیں جبکہ پنجابی زبان والے عمل درآمد پر پابند رہتے ہوئے سب سے Relevant شعبۂ کمپیوٹر کے A.T.M. مشین پر بھی پنجابی زبان کو متعارف کرا چکے ہیں۔ ہم اردو والے سرکاری فنڈ سے من وسلویٰ کے انتظار میں بیٹھے اردو میں وفاداری کا دعوا کر رہے ہیں۔

دراصل اردو کی آبیاری اور اردو کو اس کا واجب منصب اور حق دلانے کے لیے ہم کس قدر عمل پیرا ہیں، اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ سمینار اور سمپوزیم منعقد کرانے کے بجائے گاہے بہ گاہے ایک ایسی نشست بلائی جائے جس میں اردو کے تئیں اردو والوں کی عملی کارکردگی، کارگزاری، سنجیدہ کوشش پر تبادلۂ خیال ہو اور مثبت فکر وعمل کی روشنی میں مشورے اور تجاویز پاس کیے جائیں۔

■ **ڈاکٹر اے۔ جبار راجن، "امن" گاندھی اسٹریٹ، اتر دلی-202280 علی گڑھ (یوپی)**

"اردو دنیا" مسلسل مل رہا ہے۔ شکریہ۔ ہر شمارہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہ رسالہ "سنگ میل" کی حیثیت رکھتا ہے اور اردو والوں کے لیے ایک قیمتی دستاویز ہے۔ آپ اردو کے ادبا وشعرا کے ساتھ دیگر معروف ہستیوں کے حالات زندگی سے روشناس کرانے میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ستمبر 2003 میں جناب بھیشم ساہنی اور اکتوبر میں جناب اے۔ ایم۔ خسرو سے متعلق آپ نے بھرپور معلومات فراہم کیں۔ ستمبر کے شمارے میں جناب وی۔ ایس۔ مہاجن کا مضمون "دیہی بچوں کی تعلیم" بے حد پر اثر اور حقیقت انگیز ہے۔ دیہات میں اردو کی تعلیم حاصل کرنے والے بہت ہیں۔ ہم بھی ایک قصبے میں رہ کر یہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔

■ **ڈاکٹر ادریس انصاری، حاجی اللہ بخش ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، 71، بدھوارہ مین روڈ، نزد ملا حیاتی کی مسجد، برہانپور-450331 (ایم پی)**

ماہ اکتوبر 2003 کے "اردو دنیا" میں جمیل اختر صاحب کا مضمون "اردو۔ دوسری سرکاری زبان اور ہماری ذمے داریاں" پڑھا۔ مجھے بے حد پسند آیا۔ اردو کے بارے میں ان کی سوچ سے میں پورا اتفاق رکھتا ہوں۔ آج زیادہ نہیں ہر ریاست میں دو چار لوگ بھی ایسے اردو کے سچے بہی خواہ پیدا ہو جائیں تو اس دم توڑتی اور سسکتی زبان کے فروغ میں چار چاند لگ جائیں۔ آج جو لوگ اردو کے نام کی روزی روٹی کھا رہے ہیں، ان کے بچے انگلش میڈیم میں پڑھ رہے ہیں۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ اردو کے نام کی جو بھی تنظیم بنی ہے، وہ صرف اور صرف اپنا الو سیدھا کرنے میں لگی ہے۔ آج ہماری قوم میں تعلیم کی سخت ضرورت ہے اور وہ بھی خاص طور سے اردو تعلیم کی۔ ہمارے یہاں مدھیہ پردیش میں پروفیسر حلیم خاں نے اردو تعلیم کے معاملے میں انقلابی کام کیا ہے اور مدرسہ بورڈ قائم کر کے مسلمانوں کے لیے ایک ایسا پلیٹ فارم دیا ہے، جس میں کسی بھی عمر کے پڑھنے والے 10 ویں اور 12 ویں کلاس کا امتحان دے سکتے ہیں۔ میں یہاں پر پچھلے 3 سال سے ایک ماڈرن مدرسہ ابو ہریرہ چلا رہا ہوں جس میں دینی اور دنیاوی دونوں تعلیم کا انتظام ہے۔ 114 بچے 5 ویں کلاس میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

■ **اشفاق برادر، 131/303، بیگم پروا، کانپور-208023**

اکتوبر کے شمارے میں علی محمد خسرو مرحوم کے بارے میں تفصیلات پڑھیں، مرحوم بہت بڑی شخصیت کے مالک تھے۔ ایک دور تھا جواب ہمارے درمیان موجود نہیں ہے۔ "اردو دنیا" کے مضامین حالات حاضرہ اور مستقبل میں پیش آنے والے مرحلوں کو اجاگر کرنے میں کامیاب ہیں اور اردو والے اس سے فیض اٹھا رہے ہیں۔ اردو کی صورت حال، عصری مسائل، ترقی اور ملازمت کے پیش نظر کمپیوٹر کا ہر شعبۂ زندگی میں دخل اور سرکاری، پرائیویٹ نوکریاں، ادب کا منظر نامہ، یوں کہنا بہتر ہوگا کہ ایک بہترین کوشش آپ کی رہنمائی میں ہو رہی ہے۔

■ **شاغل ادیب، زیب منزل، 1-4-304/9/3، صدیق نگر، مشیر آباد، حیدر آباد-500048**

"اردو دنیا" ہر ماہ پابندی سے باصرہ نواز ہو رہا ہے۔ آپ اسے ہر ماہ خوب

سے خوب تر بنا رہے ہیں اور اردو زبان و ادب کے فروغ کا ایک اچھا اور سچا ترجمان بنا کر پیش کر دیتے ہیں۔ یقین جانیے کہ ہر ماہ آپ کے گراں قدر جریدے کے مطالعے کے بعد ہر قاری، ہر شاعر، ہر ادیب اور ہر دانش ور تمام اردو دنیا کی ادبی سرگرمیوں سے جان کاری حاصل کر کے ایک ذہنی سکون اور ایک دلی سرور پاتا ہے۔ اردو کے کسی اور رسالے میں اردو سے متعلق اتنی تفصیلات قطعی نہیں ملتیں۔

■ **الطاف انجم بلدار بستی چرار شریف، کشمیر-191112**

سرینگر کے کتاب میلے نے ناچیز کو از حد متاثر کیا۔ اپنی حیثیت کے مطابق میں نے بھی کافی کتابیں خریدیں۔ آپ سے مخلصانہ التماس ہے کہ ہر سال ایسے میلوں کا انعقاد کیا جائے۔ ''اردو دنیا'' کے حوالے سے ایک تجویز یہ ہے کہ ''کوئز'' خالص ادبی استفسارات پر مبنی ہونا چاہیے کیونکہ اردو سے وابستہ لوگوں کے لیے عموماً اور طلبہ کے لیے خصوصاً یہ ایک بیش قیمت خزانہ ہے جو کہ پچاس کتابوں کے مطالعہ کے بعد ہی حاصل ہوگا اور یہاں صرف کوئز کی وساطت سے حاصل ہو جاتا ہے۔ اگر سوالوں کی تعداد بڑھائی جائے تو اردو داں طبقہ آپ کا مرہونِ منت ہوگا۔

ہمارا مقصد اپنے قارئین کو اردو کے علاوہ دیگر سیاسی، سماجی، اقتصادی اور سائنسی مضامین سے متعلق تفصیلات بہم پہنچانا ہے۔ اس لیے ادارے کی کوشش ہوتی ہے کہ ہر موضوع پر کوئز پیش کی جائے۔

■ **ڈاکٹر افضال عاقل، کاشانۂ حسین، 72، مسلمان پاڑا روڈ، پوسٹ گرولیہ، ضلع-24 پرگنہ، ویسٹ بنگال**

''اردو دنیا'' ہر اعتبار سے جدید معلومات کا ایک خزانہ ہے۔ اس کے مشمولات نہ صرف یہ کہ عام فہم زبان میں ہیں بلکہ ان سے پڑھنے والوں کو بہت کچھ حاصل ہوتا ہے۔ یہ رسالہ فرسودگی اور دقیانوسیت کے خلاف ایک مستحکم آواز بن چکا ہے۔

■ **ڈاکٹر رضوان احمد، اولڈ ٹریڈرس لین، ورزی ٹولہ، پوسٹ باغی پور، پٹنہ-4**

اردو اخبارات میں خبر نظر سے گزری کہ آپ کا سری نگر کتاب میلہ بے حد کامیاب رہا۔ ایسے ماحول میں ادب، صحافت، ثقافت، کتب و رسائل کی باتیں کرنا آپ ہی کا دل گردہ ہے جس کے لیے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

■ **عبدالنعیم بگلوبل انسٹی ٹیوٹ (اردو کمپیوٹر سینٹر) شانت گھر جانی پور، جموں**

''اردو دنیا'' پابندی سے پڑھتا ہوں۔ رسالے کا معیار اور آپ کی کاوشیں قابلِ تعریف ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی خدمات سے اردو داں طبقے کو یوں ہی مستفید کرتا رہے۔ میں نے قومی اردو کونسل کی طرف سے چلائے جا رہے کمپیوٹر اپلی کیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی. ٹی. پی کورس گلوبل انسٹی ٹیوٹ، جموں سے کیا اور اس کی بدولت آج فوج میں نوکری کر رہا ہوں۔

■ **ہیڈ ماسٹر، الفلاح اردو ہائی اسکول، الہ آباد**

رسالہ ''اردو دنیا'' اب زندگی کی اہم ضرورت بنتا جا رہا ہے۔ مختلف موضوعات پر عمدہ اظہار خیال ''اردو دنیا'' کا خاصہ ہے۔ ہمارا علاقہ اردو کے لیے کافی بنجر علاقہ ہے۔ مگر اب دھیرے دھیرے نمایاں تبدیلی آ رہی ہے۔

■ (قومی اردو کونسل اردو کے ساتھ ساتھ عربی و فارسی کی ترقی کے لیے بھی کوشاں ہے۔ اسی تعلق سے کونسل نے دو سالہ ڈپلوما کورس اِن فنکشنل عربی شروع کیا ہے اور اس سلسلے میں جدید اور پروفیشنل عربی کو پیش نظر رکھتے ہوئے کونسل نے دو رہنمائے دروس بھی تیار کروائے ہیں جو کہ چار شقوں پر مشتمل ہیں۔ اس کو اس کو کافی پذیرائی حاصل ہو رہی ہے— درج ذیل خط اسی کورس اور کتاب سے متعلق ہے۔)

محمد افضل اعظمی، روز ڈسٹری بیوٹرز ہمرائے میر، اعظم گڑھ

عربی نصاب کے ذیل میں چاروں وحدات کا بغور مطالعہ کیا تو دیکھا کہ یہ عربی زبان کے ہندستانی طلبہ کو نئی انفارمیشن ٹیکنالوجی سے جوڑنے میں بہت معاون ہیں۔ ڈاکٹر شفیق احمد خاں ندوی، محترمہ فرحانہ طیب اور ڈاکٹر حبیب اللہ خاں کو اس کام کے لیے اللہ تعالیٰ اجرِ عظیم سے نوازے۔ انھوں نے محنت کر کے آٹھ وحدات کی شکل میں ایک عظیم کتاب دی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر مدارسِ اسلامیہ میں ان وحدات کو شامل کر لیا جائے تو جدید عربی زبان پر طلبہ کو کافی عبور حاصل ہو جائے گا اور دیگر کتب عربیہ کے فہم میں انھیں آسانی ہوگی۔ ہم نے ان وحدات کو اپنے یہاں کے مدارس کے ذمے داروں کو دکھایا تو انھوں نے کافی پسند کیا اور قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، دہلی کی اس کوشش کی کافی تعریف کی۔

ہم نے اور ہماری شریک حیات نے دیگر مشغولیات کو ترک کر کے رات دن ایک کر کے ایک ایک وحدات کو پڑھا، جہاں نہ سمجھ سکے، دہلی کے ذریعے اس کو حل کیا، پھر امتحانات کو تیار کیا۔ اللہ کے فضل و کرم سے ان وحدات کے پڑھنے کے بعد ہم لوگوں کی عربی زبان میں کافی سدھار آیا اور یہ سارے وحدات ہم دونوں کو اچھی طرح یاد ہو گئے۔

□□□

ہماری بات

مستقبل قریب میں کیا ہندستان کے تمام لوگوں کے خواندہ ہوجانے کا کوئی امکان نظر آتا ہے؟ اس کے لیے ہمارے پاس جو وسائل ہیں، کیا وہ کافی ہیں؟ حکومتِ ہند کی طرف سے 2010 تک سب کو ابتدائی تعلیم فراہم کرنے کا نشانہ رکھا گیا ہے جس کا مطلب ہے کہ لاکھوں کی تعداد میں نئے اسکول اور کلاس روم فراہم کرنے ہوں گے، دسیوں لاکھ کی تعداد میں نئے اساتذہ کا تقرر کرنا ہوگا، پینے کے پانی اور ٹائلٹ کی بنیادی سہولتیں فراہم کرنی ہوں گی۔ اس کے علاوہ بچوں کے غیر حاضر رہنے جیسے مسائل کو حل کرنے کے لیے کچھ نئے اقدام کرنے ہوں گے۔ بچوں کو یونیفارم، کتابیں اور دوپہر کا کھانا فراہم کرنے کے انتظامات بھی کرنے ہوں گے۔ یہ پروجیکٹ جس قدر وسیع پیمانے پر پھیلا ہوا ہے اسی پیمانے پر سنجیدہ توجہ کا بھی طالب ہے۔ ان ضرورتوں کو نظر میں رکھ کر ہی مرکزی حکومت نے مختلف صوبوں میں سروشکشا ابھیان کے لیے چھ ہزار کروڑ روپے مختص کیے ہیں اور صوبوں سے کہا ہے کہ اس ابھیان میں مزید تین ہزار کروڑ کا صرفہ وہ خود برداشت کریں۔ وزارت فروغ انسانی وسائل کا اندازہ ہے کہ اس ابھیان کے تحت نہ صرف یہ کہ ایسے حالات پیدا ہوجائیں گے کہ ہر بچہ اسکول جانے لگے بلکہ ہر بچے کو کم از کم ابتدائی تعلیم بھی حاصل ہوسکے گی۔

قومی خواندگی کے حصول کو یقینی بنانے کے لیے مرکزی حکومت کے پیشِ نظر جو اقدام ہیں ان کو مستحکم بنانے کے لیے حال ہی میں چھ سے چودہ سال تک کی عمر کے بچوں کی تعلیم کو لازمی بنانے والے مرکزی قانون کا مسودہ تیار کیا گیا ہے۔ اس سے قبل 2001 میں آئین کی 86ویں ترمیم (لسلنگ کے وقت یہ 93ویں آئینی ترمیم تھی، آئین میں شمولیت کے بعد اب 86ویں ہے) کے ذریعے تعلیم کے حصول کو چھ سے چودہ سال تک کی عمر کے بچوں کا بنیادی حق قرار دیا جاچکا ہے۔ قانون کا مذکورہ مسودہ اسی حق کو قانونی بنیادیں فراہم کرنے کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ توقع ہے کہ Free and compulsory education for children bill 2003 کے نام سے موسم سرما کے حالیہ اجلاس میں منظوری کے لیے پیش کیا جائے گا۔

ناخواندگی کو جڑ سے ختم کرنے کے لیے اس بل میں کچھ منفرد طریقے اختیار کرنے کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔ مرکزی حکومت کی کوشش ہے کہ کم از کم نئی نسل کے سو فی صد بچے اسکول جاسکیں اور کسی قسم کی کوتاہی اور بہانے بازی اس معاملے میں کوئی رکاوٹ نہ کھڑی کرسکے۔ مثال کے طور پر اس بل میں ایک شرط یہ رکھی گئی ہے کہ سبھی غیر سرکاری یا پرائیویٹ اسکولوں کو غریب طبقے کے بچوں کو لازمی طور پر داخلہ دینا ہوگا۔ ان میں وہ تمام اسکول شامل ہوں گے جو CBSE یا صوبائی یا مرکزی بورڈوں سے ملحق ہیں (ظاہر ہے کہ اس فہرست میں تمام نامور پبلک اسکول بھی شامل ہیں)۔ ان تمام اسکولوں کو اپنی 20 فیصد سیٹیں خطِ افلاس سے نیچے زندگی گزارنے والے بچوں کے لیے مخصوص کرنی ہوں گی۔ امید ہے کہ تعلیم کے شعبے میں کام کرنے والے پرائیویٹ ادارے جس معیار و مہارت کے حامل ہیں اس کا فائدہ غریب طبقے کے بچوں کو مل سکے گا۔ البتہ اس کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہوگا کہ کام کو کتنی سنجیدگی سے آگے بڑھایا جارہا ہے۔

ڈرافٹ میں ایک اہم بات یہ بھی شامل ہے کہ اگر کوئی فرد، کوئی دکاندار یا کوئی کرخنداراپنے یہاں بچوں کو نوکر رکھتا ہے تو اس کے لیے لازم ہوگا کہ وہ ان بچوں کو اسکول بھیجے اور جو بچے اپنے والدین کے ساتھ رہتے ہیں ان کو اسکول میں داخل کرانے کی ذمے داری والدین کی ہوگی۔ کوتاہی کی صورت میں والدین اور سرپرستوں کو جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔

بچوں کو لازمی طور پر اسکول بھیجنے اور ان کی تعلیم کو یقینی بنانے کے لیے جو طریقے تجویز کیے گئے ہیں وہ یقیناً مثالی ہیں اور قانونی طور پر ان سے بچوں کے ہاتھوں کو مضبوطی ملتی ہے۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ گزشتہ 55 برسوں میں ہماری اس سمت میں تمام تر کوششوں کے باوجود حالات بہت حوصلہ افزا نہیں ہیں اور صد فیصد خواندگی کی منزل ابھی بہت دور ہے۔ بچوں کی بابت اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کے خصوصی اجلاس میں اپنی رپورٹ پیش کرتے ہوئے حکومتِ ہند نے اعتراف کیا ہے کہ ہندستان کے وہ دو سو ملین بچے جن کی عمر چھ سے چودہ سال کے درمیان ہے، ان میں 25 ملین لڑکیوں سمیت 43 ملین بچوں نے اسکول کا کبھی منہ نہیں دیکھا۔ تعلیم کی آئینی گارنٹی کے باوجود یہ صورتِ حال مایوس کن اور افسوس ناک ہے اور اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے صرف قانون بنانا کافی نہیں ہوگا بلکہ اس کا موثر نفاذ تبھی ممکن ہوسکے گا جب عوامی سطح پر بیداری ہو۔ عام طور پر غریب اور ناخواندہ لوگ آج بھی تعلیم کی اہمیت سے ناواقف ہیں، اس کے ساتھ ساتھ افلاس ان کو مجبور کردیتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اسکول بھیجنے کے بجائے کسی کارخانے میں بھیجیں یا اپنے خاندانی پیشے میں لگائیں۔ ایسے والدین کو بچوں کی تعلیم کی طرف راغب کرنے کے لیے کوئی ایسا لائحہ عمل تیار کرنا ضروری ہے جو ان میں تحریک پیدا کرسکے۔ یہ رغبت اس صورت میں پیدا ہوسکتی ہے جب ان کو معاشی آسودگی حاصل ہو اور اس طرح تعلیم کا مسئلہ معاشی مسئلے سے وابستہ ہوجاتا ہے۔ اس کو حل کرنے کے لیے ان تمام علاقوں میں ترقیاتی اسکیموں کا موثر نفاذ ضروری ہے جو ابھی تک پس ماندہ ہیں۔ اس کے علاوہ مقامی سطح پر کام کرنے والے رضا کار ادارے بھی اس ضمن میں اہم رول ادا کرسکتے ہیں۔ یعنی وہ مقامی مسائل کا حل تجویز کرکے بھی اپنے علاقے کے غریبوں کو اس بات کے لیے آمادہ کرسکتے ہیں کہ وہ اپنے بچوں کو لازماً اسکول بھیجیں۔ ایسے اقدامات کے ذریعے ہی مکمل قومی خواندگی کے مقصد کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔

تحریر: من موہن سنگھ
ترجمہ: فاخر شہیر عباسی

گیسٹ کالم

تعلیم برائے ترقی

ہمارا ملک سرسید احمد خاں کا شکر گزار ہے۔ ان کی دوراندیشی، دانشمندی اور خاص طور سے تعلیم کے ذریعے انسانی وسائل کو ترقی دینے اور سماج کی قلبِ ماہیت میں جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے کردار پر ان کی تاکید نے جدید ہندستان کے فروغ میں نہایت اہم رول ادا کیا ہے۔ سرسید ان اوّلین رہنماؤں میں سے تھے، جنھوں نے غریب اور پسماندہ مسلم طبقے کی ترویج و ترقی اور مقتدریت کے لیے تعلیم کی اہمیت کو محسوس کرلیا تھا۔ سرسید کئی معنوں میں جدید ہندستان کے سب سے بڑے مصلحین میں سے ایک اور ایک عظیم قومی معمار تھے۔ جو پودا انھوں نے لگایا تھا وہ آج اعلا تعلیم کا ایک عظیم قومی مرکز بن چکا ہے اور اس نے ہمارے ملک کے دانشور طبقے پر ایک گہرا اثر ڈالا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد کے موقعے پر اپنے خطبے میں کہا تھا:

''وہ نقوش جو آپ کے اسٹریچی ہال کی دیواروں پر کندہ ہیں، ہوسکتا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ دھندلے ہوجائیں۔ لیکن جو نقوش علی گڑھ نے ہندستان کی تاریخ کے جدید عہد پر چھوڑے ہیں وہ کبھی دھندلے نہیں ہوسکتے۔ مستقبل کے مورّخین جدید ہندستان کے فروغ میں معاون وسائل میں سے ایک اہم وسیلے کو علی گڑھ میں تلاش کریں گے۔''

میں آپ سب کے ساتھ سرسید احمد خاں کی روح کو خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوں۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ علی گڑھ کی آنے والی نسلوں کے اساتذہ اور طلبہ ان کے دانشمندانہ جوش و خروش کے نقشِ قدم پر گامزن رہیں اور ان کا نصب العین علم کی نئی اونچائیوں کی جستجو ہو جس کا استعمال وہ انسانیت کے فروغ میں کریں گے۔

میں اس موقعے پر ان تمام طلبہ کو مبارکباد دیتا ہوں جنھوں نے بڑی جانفشانی کے ساتھ اپنی تعلیم مکمل کرتے ہوئے ڈپلوما اور ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ میں ان سب کے بہتر مستقبل کا متمنی ہوں۔ سرسید احمد خاں اُس عہد میں تھے جب صنعتی انقلاب نے نہ صرف یہ کہ انگلینڈ اور یورپ کی اقتصادیات کی بڑی حد تک قلبِ ماہیت کردی تھی بلکہ اس سے عالمی پیمانے پر طاقتور رشتوں میں بنیادی تبدیلی بھی رونما ہوگئی تھی۔ انگلینڈ میں 1760 کے صنعتی انقلاب کے رونما ہونے سے پہلے ہندستان کپڑوں اور دوسری صنعتی اشیا کی پیداوار کا ایک بڑا ملک تھا۔ یورپ کے امرا ہمارے بنکروں کے تیار کیے ہوئے ہندستانی کپڑے زیبِ تن کرنا باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ لیکن صنعتی انقلاب سے وابستہ تکنیکی ترقی نے ہندستانی صنعت کی مقابلہ آرائی کی صلاحیت کو برباد کردیا۔ ساتھ ہی ساتھ ان ترقیوں نے ایشیائی ملکوں کی بہ نسبت یورپ کی اقتصادی، فوجی اور سیاسی طاقت کو بھی بڑھاوا دیا۔ نتیجے کے طور پر ایشیائی ملکوں پر ہونے والے یورپی تسلط کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں تفصیل سے ملتا ہے۔ واضح طور پر ایشیا کی ناکامی اور زوال کی بہت ساری وجوہات تھیں۔ لیکن میرے نزدیک سب سے بنیادی وجہ یہ تھی کہ ہندستان جیسے ممالک یورپ میں ہونے والی سائنسی اور تکنیکی ترقیوں سے نابلد تھے۔ سرسید احمد خاں اس تلخ حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ انھوں نے ہندستان اور یورپ کے درمیان بڑھتی ہوئی علمی خلیج کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی۔ اس کے لیے انھوں نے ہندستانی آبادی کے دانشور طبقے کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور ان کے اندر ایک نئی قومی بیداری پیدا کی۔

جدوجہدِ آزادیِ ہند کے رہنما ہندستان کی غریبی، جہالت اور بیماری سے اچھی طرح واقف تھے جس میں برطانوی حکومت کے زیرِ اقتدار اور بھی زیادہ اضافہ ہو رہا تھا اور ہندستانی عوام کا ایک بڑا طبقہ اس سے متاثر تھا۔ انھوں نے محسوس کرلیا تھا کہ غریبی کو دور کرنے کے لیے سب سے پہلے نوآبادیاتی حکومت کا خاتمہ ضروری ہے۔ حالانکہ وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ سیاسی آزادی اسی وقت بہتر طور سے بارآور ہوسکتی ہے جب ہم ہندستان کے لاکھوں کروڑوں لوگوں کی غریبی کو دور کرسکیں اور اس کے لیے دوسری چیزوں کو عمل میں لانے کے ساتھ ہمیں جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کا بھرپور استعمال کرنا ہوگا۔ جواہر لال نہرو خاص طور سے ہندستان کے سماجی اور اقتصادی احیا میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے کردار پر بہت زور دیا کرتے تھے۔

آزادی کے بعد ہمارے ملک نے ہر میدان میں خاطر خواہ ترقی کی ہے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ ترقی ایک کھلے سماج اور جمہوری سیاست کی بنیاد پر ہے۔ ہمارے اقتصادی نظام میں بہت زیادہ تنوع پیدا ہوچکا ہے۔ یہاں تک کہ زراعت بھی سائنسی مزاج قبول کرچکی ہے۔ ہمارے پاس اب سائنسی، تکنیکی اور انتظامی صلاحیتوں کا بہت وسیع خزانہ ہے۔ بنیادی سماجی خدمات جیسے تعلیم اور صحت وغیرہ میں بہت اہم ترقی ہوئی ہے۔ پیدائش کے وقت زندگی کی امید آزادی کے وقت کے مقابلے میں دوگنی سے زیادہ ہوگئی ہے۔ ان سب کے باوجود ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ترقی کی مجموعی رفتار عوام کی امیدوں اور ہماری

● (راجیو سبھا میں حزبِ اختلاف کے رہنما جناب من موہن سنگھ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے 54 ویں سالانہ کنووکیشن میں 27/مارچ 2003 کو اپنا خطبۂ صدارت پیش کیا۔ موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر یہ خطبہ قارئین ''اردو دنیا'' کی نذر ہے۔)

اقتصادی صلاحیت کے مقابلے میں بہت کم ہوئی ہے۔ ہمارے ملک کے تقریباً 25 فی صد عوام ابھی بھی غربت کی خط سے نیچے رہتے ہیں۔ تمام لوگوں کی بنیادی تعلیم تک رسائی کا خواب اب بھی نامکمل ہے۔ شیر خوار بچوں اور ماؤں کی شرح اموات آج بھی بہت زیادہ ہے۔ عورتوں کو ترقی کی راہ میں برابری کا درجہ دینے کے سماجی اور اقتصادی منصوبوں نے ابھی تک مناسب رفتار نہیں پکڑی ہے۔ ہندستان کے زمینی اور آبی وسائل کی زبوں حالی اور شہروں میں بڑھتی ہوئی آلودگی نے خطرناک صورت اختیار کرلی ہے۔ ہمارے مزدوروں کی موجودہ تعداد سالانہ 10-9 لاکھ کی شرح سے بڑھ رہی ہے۔ ہم بڑے پیمانے پر روزگار کے نئے مواقع فراہم کرنے کے قابل نہیں ہوسکے ہیں جس کے ذریعے ہم نئے آنے والوں کو اپنی مزدور طاقت میں کھپا سکیں۔ اس طرح بے روزگاری ایک بڑے سماجی اور اقتصادی مسئلے کی شکل میں ابھری ہے۔

اب یہ عام طور سے تسلیم کرلیا گیا ہے کہ ہمارے اہم سماجی اور اقتصادی مسائل کو حل کرنے کے لیے اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے کہ ہم اپنی سماجی اور اقتصادی ترقی کی رفتار کو تیز کریں۔ غربت کے مسئلے کا نتیجہ خیز حل اسی صورت میں نکل سکتا ہے جب ہماری بنیاد تیزی سے بڑھتی ہوئی اقتصادیات پر ہو۔ یہاں تک کہ منافع کو دوبارہ غریب طبقے میں تقسیم کرنے کی کوشش بھی تیزی کے ساتھ بڑھتی ہوئی اقتصادیات میں ہی کامیاب ہوتی ہے نہ کہ سست رفتار اقتصادیات میں۔ دوسری قسم کی اقتصادیات میں دوبارہ تقسیم کو مثبت مجموعہ کے بجائے صفر مجموعہ کا کھیل سمجھا جاتا ہے جس سے بہت زبردست سیاسی اور سماجی احتجاج سامنے آتا ہے۔

اکیسویں صدی کے آغاز میں ہندستان کی سماجی اور اقتصادی ترقی کو آگے بڑھانے کا منصوبہ ماضی کے ترقیاتی منصوبوں کا محض ایک سلسلہ نہیں ہوسکتا۔ اس سلسلے میں، میں ان دو بڑی قوتوں کی اہمیت کو اُجاگر کرنا چاہتا ہوں جو اس وقت فعال ہیں۔ سب سے پہلے تو سائنسی اور تکنیکی علم خاص طور سے انفارمیشن، مواصلات، نقل وحمل اور بایوٹیکنالوجی کے میدانوں میں قابلِ قدر ترقیاں ہوئی ہیں جس سے نئی مصنوعات اور انھیں بنانے کے نئے نئے طریقے بہت تیز رفتاری سے ظہور میں آرہے ہیں۔ دوسری طرف چونکہ یہ نئی مصنوعات اور ان کو بنانے کے طریقے بہت وسیع تحقیق اور ترقیوں کا نتیجہ ہیں اس لیے عالمی پیمانے پر آزاد تجارت پر لگی ہوئی پابندیوں اور بے قاعدگیوں کو ہٹانے کے لیے زور ڈالا جارہا ہے جس سے تجارت، ٹیکنالوجی اور سرمایے کو ملک کی سرحدوں کے آر پار آزادانہ طور پر لے جایا جاسکے۔ ہمیں ان دونوں قوتوں کی نقل وحمل پر خاص طور سے توجہ دینی ہوگی جو عالمی سطح پر ابھرتے ہوئے علمِ اقتصادیات اور عالمگیریت کے عمل کا نتیجہ ہیں۔

اس ابھرتے ہوئے عالمی اقتصادی ماحول میں اپنی جگہ بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی اشیا اور خدمات کی تیاری، پیداوار اور تقسیم کے عمل کو تیزی کے ساتھ نئے تقاضوں کے مطابق بنائیں۔ تجارت پر سے پابندیاں ہٹ جانے کے بعد ہماری صنعتیں اسی صورت میں قائم رہ سکیں گی جب وہ اثر آفریں اور عالمی سطح پر مقابلے کے لیے تیار ہوں۔ ان ترقی یافتہ حالتوں کے نتائج یہ ہوں گے کہ مستقبل کی پیداواری صنعتیں ماضی کی طرح زیادہ مزدوری طلب نہیں ہوں گی۔ اسی طرح اگر بڑھتی ہوئی بے روزگاری کو دور کرنا ہے تو ہمیں ملازمت کے میدان میں اور دیہی ترقیوں میں روزگار کے نئے مواقع فراہم کرنے ہوں گے۔ دیہی زندگی کی کیفیت میں معنی خیز بہتری کے بغیر ہم بگڑی ہوئی دیہی آبادی کا شہری جھونپڑیوں کی طرف تیزی کے ساتھ بہاؤ بروقت نہیں روک سکیں گے۔ علاوہ ازیں تیزی کے ساتھ تبدیل ہوتے تقاضوں اور تکنیک کی اس دنیا میں ماضی کے مقابلے میں کہیں زیادہ غیر یقینی حالات درپیش ہوں گے۔ اگر قابلِ یقین سماجی تحفظ نہیں دیا جائے گا تو بڑھتے ہوئے غیر یقینی حالات سے، قابو میں نہ آنے والی بے اطمینانی اور بے چینی میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر ابھرتے ہوئے علمِ اقتصادیات کے ترقیاتی نتائج کو برابری کے ساتھ بانٹنا ہے تو ملک کو اپنے تعلیمی اور صحت کے نظام کو تیزی کے ساتھ وقت کے تقاضوں کے مطابق بنانا ہوگا اور ان بنیادی سماجی خدمات تک غریبوں کی رسائی کو یقینی بنانا ہوگا۔ ہماری تحقیقی اور ترقیاتی تنظیموں کو عوام کے اندر اطمینان بخش حالات پیدا کرنے ہوں گے اور پیداوار کے عمل کو جدید تکنیک کے مطابق بنانا ہوگا ساتھ ہی اس بات پر بھی توجہ دینی ہوگی کہ ہماری مصنوعات کی اقسام اور ان کے نمونے زیادہ بہتر ہوں تاکہ ہم عالمی سطح پر مقابلہ کرسکیں۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہندستان الگ تھلگ رہ کر فروغ نہیں پاسکتا۔ ہمیں ترقی پذیر عالمی اقتصادیات کے ساتھ ہندستانی اقتصادیات کے ترقی پسند انضمام کی پالیسی اختیار کرنی ہوگی۔ عالمگیریت میں مواقع بھی ہیں اور خطرات و مبارزات بھی۔ لیکن غالباً یہ ایک ایسا عمل ہے جسے بدلا نہیں جاسکتا۔ ہمیں عالمگیریت کے پیش کردہ مواقع سے پورا فائدہ اٹھانے اور اس سے وابستہ خطرات کو کم کرنے کے لیے پراثر ترقیاتی منصوبے اپنانے ہوں گے اور ایسا کرنے کے لیے ہمیں اپنے حالات کو مدنظر رکھنے کے ساتھ ہی ساتھ نئی عالمی حقیقتوں پر بھی نگاہ رکھنی ہوگی جنھیں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ گذشتہ دس برسوں میں ہماری انفارمیشن ٹیکنالوجی کی صنعت کی ترقی، نئے مواقع سے استفادہ کرنے اور ترقی پذیر عالمی اقتصادیات میں کامیابی حاصل کرنے کا ایک خوشگوار واقعہ ہے۔ اس طرح کے مواقع دوسری صنعتوں میں بھی موجود ہیں خاص طور سے بایوٹیکنالوجی میں۔ ضرورت ہے ان مواقع کو پہچاننے اور ان سے فائدہ حاصل کرنے کی۔

جب میں نئے ابھرتے ہوئے علمِ اقتصادیات کی طرف دیکھتا ہوں تو لگتا ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں کو اس نئے علم کی پیدائش، تصرف اور استعمال میں زیادہ موثر اور کارگر ار ہونا پڑے گا۔ نئی تکنیکوں کی تخلیق اور انھیں تجارتی طریق پر چلانے کے لیے یونیورسٹیوں، تحقیقی اور ترقیاتی اداروں اور صنعتوں کے درمیان نئے رشتے استوار کرنے ہوں گے۔ خاص

طور سے ہمارے تعلیمی نظام میں دوبارہ جان ڈالنے کی ضرورت ہے جس سے وہ نئے ابھرتے ہوئے علمِ اقتصادیات کے چیلنج سے نبرد آزما ہوسکے۔ اعلا معیار کی ثانوی تعلیم کی ہمہ گیر رسائی کے بغیر تربیت یافتہ سائنسی و تکنیکی افتیار مہیا کرنا دشوار ہوگا۔ ہمارے اسکولوں اور یونیورسٹیوں دونوں میں سائنس اور تکنیک کی تعلیم کی بنیاد مستحکم کرنے کے لیے سخت اقدام کی ضرورت ہوگی۔ اس لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ تعلیم، سائنس، ٹیکنالوجی اور تحقیقی و ترقیاتی کاموں میں لگنے والے ملک کے سرمائے میں اور گرانقدر اضافہ کیا جائے۔ سرسید احمد خاں کی، عورتوں اور اقلیتی و پسماندہ طبقوں کو خودمختار بنانے کے لیے تعلیم کو ایک موثر آلے کے طور پر استعمال کرنے کی اوّلین سرگرمیوں کو ہمیں دوبارہ اختیار کرنا ہوگا۔ یہی ایک راستہ ہے جس سے ہم علم کی حدوں کو چھو سکتے ہیں اور علم کے اس خلا کو پُر کرنے کی امید کرسکتے ہیں جس نے ہندستان کو دنیا کے بڑے ترقی پذیر ممالک سے الگ کر دیا ہے۔ اس علمی خلا کو پُر کرنے میں ناکامی ہمیں ناکارہ ثابت کردے گی اور ہم اس ترقی پذیر عالمی اقتصادیات میں محض حاشیے کے ایک کھلاڑی کی طرح رہ جائیں گے۔ مغربی ایشیا میں رونما ہونے والے حالیہ واقعات اس بات کی سخت یاددہانی کراتے ہیں کہ بین الاقوامی رشتے بنیادی طور پر محض طاقت کی بنا پر استوار ہوتے ہیں۔ عالمی امن و آشتی کی حمایت میں اور ایک انصاف پرور عالمی نظم وضبط کے لیے ہندستان کی آواز اسی وقت موثر ہوسکتی ہے جب ہم اپنے ملک کی اقتصادیات کی وسیع پوشیدہ قوتوں کو محسوس کرلیں گے۔

سماجی اور اقتصادی تبدیلیوں سے وابستہ مسائل کا ذکر کرتے ہوئے اس بات کی شناخت ضروری ہے کہ کوئی بھی اقتصادیات، سیاسی اور سماجی خلا میں کارگر نہیں ہوتی۔ ٹیکنالوجی میں تیز بدلاؤ، ترقی کی دوڑ میں آگے نکل جانے کے نئے مواقع فراہم کرتا ہے، لیکن اس سے بے اطمینانی کے نئے ذرائع بھی پیدا ہوتے ہیں۔ ہمیں ضرورت ہے ایک مؤثر، کارگر اور منصفانہ اقتدار کی جو انتظامی امور کی سربراہی کرے اور اقتصادی نمائندوں کو ماحولیاتی بے اطمینانی سے مقابلہ کرنے میں معاون ہو۔ اس سلسلے میں ہمارے آئین میں دی گئی اقدار کے نظام کے تئیں ایک مضبوط اور ناقابلِ تنسیخ عہد سے زیادہ اہم اور کوئی چیز نہیں ہے جس میں سیکولرزم، تمام شہریوں کی ان کے مذہب، نسل اور رنگ سے قطع نظر قانون کی نظر میں برابری، قانون کے احکام کے مؤثر نفاذ اور اس وسیع وعریض سرزمین پر پائے جانے والے تہذیبی، لسانی و مذہبی اختلافات پر خاص طور سے زور دیا گیا ہے۔

نئے ابھرتے ہوئے علمِ اقتصادیات کے ماہرین جیسے انفوسس (Infosys) کے جناب نارائن مورتی، آنے والے ان خطرات سے بخوبی واقف ہیں جو ہمارے منتظر ہیں، اگر ہم اپنی جمہوریت کے بانیوں کی سیاسی دوراندیشی سے انحراف کرتے ہیں۔ اپنے درباری سیٹھ میموریل لیکچر میں انھوں نے سیکولرزم کے کردار کو ہندستان کی سماجی اور اقتصادی ترقی کے لیے ایک بنیاد کی حیثیت سے نمایاں کیا ہے۔ جناب نارائن مورتی کے مطابق: ''سیکولرزم ایک نظام ہے جس میں افراد کے درمیان اور ساتھ ہی افراد اور اداروں کے درمیان کسی بھی پارٹی کے مذہبی خیالات کو بالائے طاق رکھ کر معاملات ہوتے ہیں اور جہاں پر ہر فرد کے لیے اس کے مذہبی یا نسلی الحاق سے قطع نظر برابر موقع دستیاب ہوتا ہے۔'' ایک کثیر مذہبی معاشرے میں سماجی اور اقتصادی ترقی، اس تعریف کی بنیاد پر زندگی گزارنے سے ہی قائم رہ سکتی ہے۔ قانون کے احکام کی بجا آوری، زندگی اور جائیداد کے تحفظ اور معاہدوں کے احترام کے بغیر ہم دنیا کی اقتصادیات میں ایک بڑی طاقت کی حیثیت سے آگے بڑھنے کی امید کبھی نہیں کرسکتے۔ اس عہد سے کسی صورت میں بھی انحراف ہماری ترقی کی توقعات سے منہ موڑ لینے کے مترادف ہوگا اور ظاہر ہے کہ ہمارے تہذیبی اور ثقافتی ورثے سے بھی، جیسا کہ تھامس ہابس (Thomas Hobbes) نے ایک بار کہا تھا: ''ایک قدیم اور فرسودہ زندگی جہاں انسان کی زندگی غریب، گندی، گاودی اور کم ہوگی'' اس لیے ہمیں اپنے انتظامی امور میں نظر آنے والے اس رجحان کو ختم کرنا ہوگا جس کے بہت ہی خطرناک نتائج سامنے ہیں۔ قبل اس کے کہ بہت دیر ہوجائے، ہماری حکومت، سیاسی پارٹیوں، شہری سماجی اداروں اور تعلیمی اداروں کو بیدار ہوجانا چاہیے۔

میں خلوص کے ساتھ امید کرتا ہوں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، اس کے اساتذہ، محققین اور طلبہ ہندستان کو جنگ، احتیاج اور ناجائز انتفاع کے خطرات سے آزاد کرنے اور ہندستان کو دوبارہ فروغ دینے کی نئی قومی تحریک میں پیش پیش رہیں گے۔ جس طرح سے ہندستان اپنے مختلف تضادات کے انتظام کو سنبھالتا ہے اور بردباری کی تہذیب کو ترقی دینے اور اسے قبول کرنے میں جس حد تک ہم کامیاب ہوئے ہیں، اس سے انسانی تہذیب کے مستقبل کی رفتار طے کرنے اور تہذیبوں کے مابین تصادم کے بجائے مکالمے کو فروغ دینے کی ہماری اہلیت اور بھی زیادہ اثر انداز ہوگی۔ یونیورسٹیاں اس سلسلے میں ایک اہم کردار ادا کرسکتی ہیں۔ ایسی تعلیم دینا جس سے ذہنوں میں سیکولرزم کا فروغ ہو اور اس ذہنیت کے مرد اور عورتیں پیدا کرنا جو علم اور سچائی کی جستجو کے مقصد سے گہرائی سے وابستہ ہوں، ملک کی تعمیر کرنے والی صنعتوں کی بنیادوں کو زیادہ مستحکم کرسکتے ہیں۔ کارڈنل نیومین (Cardinal Newman) نے اپنی مشہور کتاب The Ideas of a University میں ایک سچے آدمی کی اس طرح تعریف کی ہے:

''وہ شخص جو انسانی عقل کی کمزوری کو اسی طرح پہچانتا ہے جیسے اس کی قوت اور اس کی حدوں کو، وہ مذہبی بردباری اور نرم مزاجی کا رفیق ہے۔ اور نہ صرف یہ کہ اس کے فلسفے نے تمام قسم کے عقائد کو ایک نگاہ سے دیکھنا سکھایا ہے بلکہ نرم مزاجی اور نازک خیالی سے بھی آشنا کیا جو کہ تہذیب کی رفیق ہے۔''

خدا آپ کے علم اور روشن خیالی کے اس عظیم الشان مقصد میں آپ کی مدد فرمائے۔ (بشکریہ ''یونیورسٹی نیوز'' دہلی-28 جولائی 2003) ☐☐☐

355, Jhelum Hostel, JNU, New Delhi

انبساط احمد علوی/نفیس احمد

اردو ہماری اپنی زبان ہے — جسونت سنگھ

سوال: آپ ملک کے وزیر خزانہ ہیں۔ لیکن آپ سے ہمارا پہلاسوال ثقافتی نوعیت کا ہے۔ خبر ہے کہ آپ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا مراسلاتی ڈپلوما کورس کرنا چاہتے ہیں اور آپ نے اس مقصد کے لیے فارم بھی پُر کیا ہے؟

جواب: آپ کی اطلاع درست ہے لیکن میں نے یہ فارم بڑی خاموشی کے ساتھ بھرا تھا۔ نہ جانے اخبارات کو اس کی سن گن کس طرح لگ گئی۔ اس بات کی تشہیر میں میری مرضی شامل نہیں ہے۔

سوال: اردو سے آپ کی اس دلچسپی کا راز کیا ہے؟

جواب: اردو سے مجھے دلچسپی کیوں ہے؟ مجھے یہ سوال کچھ اچھا نہیں لگا۔ اردو اس ملک کی زبان ہے۔ اردو ہماری مادری زبان ہے۔ ہر زبان کا اپنا ایک میزک ہوتا ہے۔ زبان سیکھ لینے سے وہ میزک دل میں گھر کر لیتا ہے۔ بدقسمتی سے میں فارسی رسم خط میں اردو پڑھ نہیں پاتا۔ اس کمی سے کئی بار یہ احساس ہوتا ہے کہ میں ہندستانی تہذیب کے ایک اہم حصے سے اس طرح ہم آہنگ نہیں ہوں جس طرح ہونا چاہیے تھا۔ اگر رسم خط سیکھ لوں گا تو یقیناً اردو سے بحیثیت ایک زبان اور کلچر سے میری ہم آہنگی میں اور اضافہ ہوگا۔ ویسے بھی میں تو سیدھا سادہ ریگستانی آدمی ہوں۔ ریگستان میں پیدا ہوا۔ وہیں پلا بڑھا اور تعلیم پائی۔ جب اس کورس کا اشتہار نظر سے گزرا تو اس میں داخلے کا فیصلہ کر کے بلاتکلف درخواست بھیج دی۔

سوال: لیکن رسم خط سے ناواقفیت کے باوجود آپ کی بول چال کی زبان تو اس وقت بھی بڑی حد تک Urduised (اردو سے متاثر) ہے؟

جواب: آپ ایسا سمجھتے ہیں، مجھے خوشی ہے۔ دیکھیے جب 1954 میں میں نے کیڈٹ کے طور پر فوج میں شمولیت اختیار کی تھی تو میری عمر پورے پندرہ سال بھی نہیں تھی۔ 1959 میں انیس سال کی عمر میں مجھے کمیشن ملا۔ اردو تو تاریخی طور سے چھاؤنیوں کی زبان رہی ہے۔ برٹش انڈین آرمی میں بھی اسے سکھانے کا رواج تھا۔ ممکن ہے میں نے فوج میں رہتے ہوئے اپنی زبان پر نامحسوس طور سے اردو کا اثر قبول کیا ہو۔ کیونکہ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، زبان تو یہ آخر ہماری ہی ہے۔ ویسے جب میں کیڈٹ تھا تو ایک بار میں نے فارسی سیکھنے کا بھی ارادہ کیا تھا۔ لیکن وہ نوجوانی کا دور تھا، لہٰذا جلد ہی فارسی کی جگہ پہلے روسی اور پھر جرمن نے لے لی۔ لیکن نتیجہ اس غیر مستقل مزاجی کا یہ نکلا کہ میں ایک غیر ملکی زبان بھی ڈھنگ سے نہ سیکھ سکا۔

سوال: انگریزی پر آپ کو لامحہ عبور حاصل ہے۔ اس کے علاوہ آپ اور کون سی غیر ملکی زبانیں سمجھ لیتے ہیں؟

جواب: فرانسیسی زیادہ سمجھ لیتا ہوں۔ لیکن کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ میں فرانسیسی کی تو فہم رکھتا ہوں جو ایک غیر ملکی زبان ہے، لیکن اپنے ملک میں بولی جانے والی تامل اور ملیالم نہیں جانتا، تو ایک شرمندگی کا احساس ہوتا ہے۔ اردو میں فارسی کے بہت سے الفاظ شامل ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح ہندی میں سنسکرت کے الفاظ داخل ہیں۔ اردو جب باقاعدہ طور سے پڑھوں گا تو یقیناً میرا اس زبان کا علم بڑھے گا۔ ویسے میں سنسکرت بھی جانتا ہوں۔ لیکن آپ نے کہا کہ میری عام بول چال کی زبان Urduised ہے تو مجھے تو اس پر خوشی ہوئی۔ اردو ایک آسان، خوبصورت اور میٹھی زبان ہے۔

سوال: اردو شاعری سے آپ کی دلچسپی مشہور ہے۔ آپ اردو کے اپنے کسی پسندیدہ شاعر کا نام بتانا پسند کریں گے؟

جواب: فیض احمد فیض۔

سوال: اس لیے تو نہیں کہ فیض بھی آپ کی طرح فوج میں رہ چکے تھے؟

جواب: نہیں۔ فیض آج کی بات، آج کی آواز اور آج کے درد کو اپنی شاعری میں سموتا ہے۔ وہ ہر لحاظ سے ہمارے عہد کا شاعر ہے۔

سوال: آپ نے اپنی انتہائی مصروفیت کے باوجود اس بات چیت کے لیے وقت نکالا ہے۔ لیکن چلتے چلتے اقتصادی امور سے متعلق بھی دو چار باتیں پوچھنا چاہیں گے؟

جواب: ضرور پوچھیے۔

سوال: کان کن کانفرنس کی ناکامی کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ایک Single Global Market (واحد عالمی منڈی) کے قیام کی کوششوں کو سخت دھکا پہنچا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ تحریک کیا ہمیشہ کے لیے ناکام ہو

● قومی اردو کونسل نے ہندی اور انگریزی کے ذریعے اردو کا مراسلاتی ڈپلوما کورس شروع کیا ہے جس میں دس ہزار سے زیادہ افراد نے داخلہ لیا ہے۔ اردو سیکھنے والوں کی اس طویل فہرست میں مرکزی وزیر خزانہ شری جسونت سنگھ بھی شامل ہیں۔ ہفت روزہ "عالمی سہارا" کے 8/نومبر کے شمارے میں موصوف کا انٹرویو شائع ہوا ہے جسے قارئین "اردو دنیا" کی نذر کیا جارہا ہے۔

چکی ہے یا مستقبل میں کسی مرحلے پر کان کن کانفرنس کے ایجنڈے پر موجود مسائل پر اب بھی زیادہ منصفانہ غوروفکر کی امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں؟

جواب: کان کن کے بارے میں اتنی بات ضرور کہوں گا کہ اگر وہاں سات آٹھ گھنٹے اور بات چیت کرلی جاتی تو یہ کانفرنس نتیجہ خیز بھی ثابت ہوسکتی تھی، لیکن اس کے ذریعے جو کامیابی ملنی تھی وہ نہیں مل سکی۔ ایسا کیوں ہوا، اس پر بہت کچھ کہا جاچکا ہے۔ میں اس میں جانا نہیں چاہتا۔ لیکن یہ سمجھنا کہ کان کن کانفرنس کے بعد اب کوئی زندگی نہیں ہے غلط ہوگا۔

سوال: ہندستان نے کان کن میں کیا کھویا، کیا پایا؟

جواب: بہت لمبی بحث ہے۔ ہم نے اپنے مفاد میں جو ضروری سمجھا کیا اور اپنے موقف پر قائم رہے۔

سوال: واحد عالمی منڈی کی عدم موجودگی سے کیا اب علاقائی تجارتی بلاکوں کو فروغ ملے گا؟

جواب: کچھ دن کے لیے تو ایسا ہوسکتا ہے۔ لیکن یہ نظریہ ہمیشہ کے لیے دلوں میں گھر کرلے، ایسا نہیں لگتا۔

سوال: کیا یہ علاقائی تجارتی بلاک ہندستان کے حق میں ہوں گے؟

جواب: اصل میں تجارتی زندگی ایک ریلوے کمپارٹمنٹ کی مانند ہے۔ آپ اپنی ضروریات کے مطابق کسی بھی ریلوے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوسکتے ہیں لیکن اپنی ضرورت کے مطابق ان کمپارٹمنٹس میں آزادانہ آمدورفت کے لیے corridor (راہداری) بھی تو موجود ہوتا ہے۔

سوال: ایک جمہوری ملک کی حیثیت سے ہندستان کا دنیا میں بڑا نام ہے۔ لیکن اقتصادی اعتبار سے ہمیں آج بھی ایک underachiever (اپنی استعداد سے کم کامیابی حاصل کرنے والا) بلکہ دنیا کا سب سے بڑا underachiever قرار دیا جاتا ہے۔ اس تضاد کی آپ کیا توجیہ کرتے ہیں؟

جواب: مجھے اس لفظ پر سخت اعتراض ہے۔ بلکہ میں تو سرے سے ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک جیسی اصطلاحات کے استعمال کا ہی مخالف ہوں۔ آخر کون سا ملک ہے جو یہ کہہ سکے کہ میں تو ترقی یافتہ ہوں اور باقی سب پسماندہ ہیں۔ اگر آپ کی جیب میں پانچ پیسے زیادہ ہیں تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہوسکتا کہ آپ دوسروں کو حقیر سمجھنے لگیں۔ صحیح بات کہہ رہا ہوں۔ میں ایک ٹرسٹ کا ٹرسٹی ہوں جس کے پاس سولھویں صدی کا ایک نادر الوجود مغلی تنبو ہے۔ 87-1986 کی بات ہے کہ نیویارک کی میٹروپولیٹن آرٹ کونسل نے اپنی ایک نمائش کے لیے یہ تنبو ہم سے طلب کیا۔ ٹرسٹی حضرات نے کہا کہ لے جانے دیجیے۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس تنبو کو کھڑا کرنا ایک ہنر ہے جس سے اس نمائش کے کرتا دھرتا ناواقف تھے۔ لہٰذا ہم نے یہ تنبو نیویارک بھیجا تو ضرور لیکن صرف اپنے کاریگروں کے ساتھ۔ وہاں ہمارے ایک کاریگر سے کوئی پوچھ بیٹھا کہ ہمارے یہاں تو یہ فلک بوس عمارتیں کھڑی ہیں۔ تمھارے یہاں کیا دھرا ہے؟ اس نے کہا ایسی عمارتیں تو ہم بھی کھڑی کرسکتے ہیں۔ لیکن ہمارے آباواجداد جب کوئی قلعہ، محل یا مندر بنانے کا ارادہ کرلیتے تھے تو جب تک وہ اپنے دل و دماغ میں اس کا آخری پتھر نہیں بٹھا لیتے تھے تو زمین پر اس کی بنیاد نہیں ڈالتے تھے۔ خود پر بھروسہ کرنا ہماری فطرت میں شامل ہے۔ یوں literate (خواندہ) تو بہت سے لوگ ہوسکتے ہیں لیکن تعلیم اور تہذیب و تمدن نری خواندگی سے ایک بالکل علاحدہ چیز ہے۔

سوال: ہندستان میں کم و بیش دو عشروں سے اقتصادی liberalisation کا تجربہ جاری ہے۔ یہ بتائیے کہ اس تجربے سے ملک کے "پسماندہ ترین طبقات" کو کیا فائدہ پہنچا؟

جواب: مجھے پسماندہ ترین جیسے الفاظ پر بھی سخت اعتراض ہے۔ کیونکہ دوسروں کو "پسماندہ سمجھنا" بھی ایک مغربی طرز عمل ہے۔ رہی بات liberalisation کی، تو یہ ایک تجربہ ہے، اقتصادی میدان میں اپنی صلاحیتوں کو آزاد چھوڑ دینے کا۔ ان صلاحیتوں کو موقع دیجیے کہ وہ ملک اور قوم کے مفاد میں کھل کر سامنے آئیں۔ ان پر سرکاری پابندیاں مت لگائیے۔ عوام بھی اس تجربے کی حکمت کو اب اچھی طرح سمجھنے لگے ہیں۔

سوال: لیکن ملک سے غربت کا خاتمہ تو اس وقت بھی دور کی بات معلوم ہوتی ہے؟

جواب: مجھے وزیراعظم کے ساتھ ایک دورے پر جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ایک جگہ تقریر کرتے ہوئے اٹل جی نے کہا کہ لوگ پہلے موٹا اناج کھاتے تھے اور کنک (گیہوں) کی روٹی صرف مہمانوں کی تواضع کے لیے پکائی جاتی تھی۔ لیکن آج ہر خاص و عام کو کنک کی روٹی کھاتے ہوئے دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ تبدیلی liberalisation کی دین ہے۔ ایک زمانے میں مشہور تھا کہ ہماری معیشت "Ship to Mouth" معیشت ہے یعنی درآمد شدہ اجناس جہاز سے اترتے ہی مفلوک الحال لوگوں کے پیٹ میں پہنچ جاتی ہیں۔ لیکن آج کی صورت حال یہ ہے کہ امریکہ میں زیر کاشت زمین کا رقبہ تو ہم سے زیادہ ہوسکتا ہے مگر قابل کاشت اور آبپاشی سے سیراب ہونے والی زمین ہمارے پاس زیادہ ہے۔ ہماری پوزیشن اس وقت ایک اجناس برآمد کرنے والے ملک کی ہے۔

(بشکریہ عالمی سہارا، دہلی 8 نومبر 2003)

□□□

مخمور سعیدی

مولانا ابوالکلام آزاد اور سیکولرزم

ہندستان کی قومی سیاست میں سیکولرزم کی اصطلاح نو وارد سہی لیکن جہاں تک ہمارے ہاں اس کے مروّج معنی و مفہوم کا تعلق ہے، ہمارا اُن کے ساتھ صدیوں پرانا تعارف ہے۔ ایک دوسرے کے مذہبی عقائد کا احترام کرتے ہوئے ایک دوسرے کے تہذیبی رویّوں کو عزت دیتے ہوئے، انسانی اخوت کے رشتے سے بندھے رہنا ہمارا قومی شعار رہا ہے۔ اس روایت کی پرورش و پرداخت میں جہاں ایک طرف مسلمان صوفیوں نے موثر کردار ادا کیا وہیں دوسری طرف ہندو سادھو سنت بھی اس کی تعمیر و ترقی کا سرو سامان بہم پہنچاتے رہے۔

انگریزوں کی آمد سے پہلے حکومتی سطح پر بھی جو پالیسیاں وضع ہوئیں اور جو نظام نافذ کیے گئے وہ مذہبی رواداری اور تہذیبی وسیع المشربی کے آئینہ دار تھے۔ مسلم اور غیر مسلم حکمرانوں میں جو معرکہ آرائیاں ہوئیں، ان کے پیچھے مذہبی اختلافات نہیں، ان حکمرانوں کی سیاسی اُمنگیں کارفرما تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں طرف کی فوجوں میں دونوں فرقوں کے جانباز سپاہی دادِ شجاعت دیتے ہوئے دیکھے جاسکتے تھے اور جب کوئی فریق غالب آجاتا تھا تو مغلوب و مفتوح علاقے کی آبادی کے ساتھ مذہب و مسلک کی بنیاد پر وہ کسی قسم کا امتیاز روا نہیں رکھتا تھا۔ سیکولرازم کی جو تشریح آج کی جاتی ہے وہ اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جو مالک رام صاحب کے لفظوں میں "صدیوں سے زہد و ورع اور رشد و ہدایت کا مرکز رہا تھا۔ ان کے والد مولانا خیرالدین مشائخ کے حلقوں میں معروف اور ممتاز تھے۔۔۔ نیز وہ کلکتے کی جامع مسجد (مسجدِ ناخدا) میں اکثر جمعے کی نماز سے پہلے حاضرین کے سامنے وعظ بھی کہا کرتے تھے۔"(1) گویا مولانا آزاد کے والدِ محترم کی ذات میں مذہب و تصوف یک جا ہوگئے تھے۔ ویسے تصوف مذہب سے الگ نہیں لیکن کٹھ ملاؤں کے برعکس، صوفیا مذہب کی تنگ نظرانہ توجیہات سے ضرور گریز کرتے ہیں۔ مولانا آزاد کی ذہنی اور جذباتی تربیت جس ماحول میں ہوئی وہ شریعت و طریقت کا ملا جلا ماحول تھا۔ اپنے دینی عقائد پر کامل ایمان لیکن دوسروں کے مذہبی تصورات کا بھی پورا احترام اور عملی زندگی میں اس کا صدق دلانہ مظاہرہ۔

مولانا نے اپنے بچپن کا ایک واقعہ ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

"میرے والدِ مرحوم نے ایک خوش نویس، حافظ مبارک بخاری کو گھر ہی رکھ لیا تاکہ ان کی تصنیفات کی تبییض کریں۔ وہ اپنے کپڑوں کی صفائی کا ذرا خیال نہیں کرتے تھے۔ ایک دن میں نے کہہ دیا کہ وہ بڑے گندے آدمی ہیں۔ میری والدہ نے نہایت دھیمی آواز میں مجھے تادیب تو نہیں تلقین کی، اور کہا: میری جان! ایسا نہ کہو، ہوسکتا ہے کہ وہ خدا کی نظر میں تم سے اور ہم سے عزیز تر ہو۔"(2)

جس بچے کی پرورش ایسی خدا ترس ماں کے سایۂ عاطفت میں ہوئی ہو، اس کا وسیع النظر، کشادہ دل اور روادار ہونا ہر طرح قرینِ قیاس ہے کہ یہ اخلاقی صفات اپنے آخری تجزیے میں خدا ترسی ہی کی پروردہ قرار پائیں گی۔ شفیق ماں کی اس نصیحت کا جو بلند بانگ لہجے میں نہیں، دھیمی آواز میں کی گئی تھی، مولانا آزاد کے کمسن دل و دماغ نے کتنا گہرا اور پائیدار اثر قبول کیا، وہ اس سے ظاہر ہے کہ جب برسوں بعد انھوں نے اپنے گزشتہ روز و شب پر نظر ڈالی تو یہ واقعہ کتابِ زندگی کے ایک ایسے روشن ورق کی طرح سامنے آموجود ہوا جسے ماہ و سال کی گرد دھندلا دینے میں ناکام رہی تھی۔

مولانا آزاد نے 1903 میں "لسان الصدق" کے نام سے جو رسالہ جاری کیا اُسے ملک و ملت سے براہِ راست تخاطب کی راہ پر ان کا پہلا قدم قرار دیا جاسکتا ہے۔ مولانا کا سالِ پیدائش 1888 ہے، گویا اس وقت ان کی عمر پندرہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس سے پہلے وہ "نیرنگِ عالم" اور "المصباح" کے ناموں سے دو جریدے یکے بعد دیگرے نکال چکے تھے، لیکن اول الذکر کی نوعیت گلدستے کی تھی جس میں مولانا آزاد اور ان کے بڑے بھائی ابو نصر آہ سمیت مختلف شاعروں کی طرحی غزلیں چھپا کرتی تھیں۔ اس کے آٹھ شمارے شائع ہوئے۔ ثانی الذکر صرف تین چار مہینے ہی جاری رہ سکا۔ "لسان الصدق" مئی 1905 تک باقاعدگی سے نکلتا رہا۔ اس کے مقاصد بھی علمی اور ادبی تھے لیکن ملکی رسم و رواج، بالخصوص مسلمانوں کی معاشرتی اور دینی اصلاح بھی اس کا ایک مقصد تھا۔ اس رسالے کے صفحات مولانا کی جن تحریروں کو سمیٹے ہوئے ہیں، ان میں مولانا کے ان افکار و خیالات کی ابتدائی جھلکیاں صاف دیکھی جاسکتی ہیں جو آگے چل کر سرسید تحریک کے بعض منفی مضمرات کی مدلل مخالفت، ہندستان کی متحدہ قومیت کی پُرزور وکالت اور غیر ملکی حکمرانوں کو ملک سے بے دخل کرنے کی منظم تحریک پر منتج ہوئے۔

"لسان الصدق" 1905 کے وسط میں بند ہوا، اور اسی سال مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا جو قومی زندگی میں مسلمانوں کی جداگانہ شناخت کی علمبردار بن کر سامنے آئی۔ قومی زندگی میں مسلمانوں کی سرگرم شرکت کے مولانا آزاد زبردست

مویدومبلغ تھے اور وہ یہ احساس بھی رکھتے تھے کہ اس فرقے کے کچھ مخصوص مسائل بھی ہیں لیکن ان کا انداز نظر مسلم لیگ سے یکسر مختلف تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ مسلمان دیگر برادرانِ وطن کے دوش بدوش چل کر ان مراحل سے عہدہ برآ ہوں، جن سے صرف وہی نہیں، پورا ملک دوچار تھا۔ اگر مسلمانوں کے کچھ مخصوص مسائل تھے تو ان کا حل بھی انھیں علاحدگی اختیار کرنے میں نہیں، اشتراکِ عمل میں نظر آتا تھا۔ ہندستان سے باہر کی اسلامی دنیا اُن دنوں جن مسائل ومشکلات میں گھری ہوئی تھی، مولانا ان کا بھی پورا درک رکھتے تھے اور ان حالات سے ہندستانی مسلمانوں کی دل چسپی کو نہ صرف قدرتی بلکہ ناگزیر خیال کرتے تھے، لیکن یہاں بھی ان کے نقطۂ نظر کی اساس خالی خولی جذباتیت پر نہیں، عقلی استدلال پر تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ہندستانی مسلمان بیرونی اسلامی دنیا کے ساتھ کسی مؤثر معاونت کے خواہاں ہیں تو یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ اوّلاً وہ اپنی داخلی صفوں کو دُرست کریں اور اس کے ساتھ ہی اپنی کوششوں میں اپنے ہم وطنوں کو بھی اعتبار و اعتماد کے ساتھ شرکت کی دعوت دیں اور ایسا اس لیے تھا کہ مولانا محض مذہبی عقیدے کے اختلاف کی بنا پر ہم وطنوں میں سیاسی تفریق کے قائل نہیں تھے۔

یہ عجب اتفاق ہے کہ اسی سال مولانا کی ملاقات شیام شنکر چکرورتی سے ہوئی جو آزادیِ وطن کے حصول کے لیے انقلابی اقدامات پر زور دیتے تھے۔ یہ لوگ مسلمانوں کو انگریز دوست خیال کرتے تھے اور اس لیے انھیں شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان سے ملاقات کے بعد مولانا آزاد نے انھیں اور ان کے ساتھیوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ یہ پوری سچائی نہیں ہے اور غیر ملکی تسلط سے نجات حاصل کرنے کا جذبہ، مراعات یافتہ کچھ خواص یا سرکاری ملازموں کو چھوڑ کر عام مسلمانوں میں بھی اتنا ہی قوی ہے جتنا دوسرے ابنائے وطن میں۔ ضرورت ان سے رابطہ قائم کرنے اور انھیں اپنے قریب لانے کی ہے۔ مولانا نے ان لوگوں سے اپنے رابطے کا ذکر کرتے ہوئے ''انڈیا ونس فریڈم'' میں لکھا ہے:

''اُن دنوں انقلابی جماعتیں اپنے کارکن صرف متوسط طبقے کے ہندوؤں سے پُر کرتی تھیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تمام انقلابی جماعتیں مسلمانوں کی مخالفت میں سرگرم تھیں۔ وہ دیکھتی تھیں کہ برطانوی حکومت نے ہندستانی تحریکِ آزادی کی مخالفت میں مسلمانوں کو آلۂ کار بنا رکھا ہے اور مسلمان اس کے اشاروں پر چلتے ہیں۔ یہ بات انقلابی محسوس کرتے تھے لیکن رفتہ رفتہ انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور مجھے ان کا اعتماد حاصل ہوگیا۔ میں نے انھیں بحث کر کے یہ یقین دلانا چاہا کہ یہ ان کا خیالِ خام ہے کہ مسلمان بہ حیثیت ایک جماعت کے اُن سے دشمنی رکھتے ہیں اور یہ مناسب نہیں ہے کہ بنگال کے چند سرکاری ملازموں کے رویّے سے انھیں جو تجربہ ہوا ہے، اسے وہ ایک عام حقیقت سمجھ بیٹھیں۔ مصر، ایران اور ترکی میں مسلمان جمہوریت اور آزادی حاصل کرنے کے لیے انقلابی کارروائیوں میں سرگرمی دکھا رہے ہیں۔ ہندستان کے مسلمان بھی سیاسی جدوجہد میں شریک ہوجائیں گے، اگر ہم ان میں کام کریں اور انھیں اپنا دوست اور ساتھی بنائیں۔ میں نے اس طرف بھی اشارہ کیا کہ اگر مسلمان مخالفت میں سرگرم اور سیاسی تحریک سے بے تعلق رہے تو آزادی حاصل کرنے کی مہم بہت دشوار ہوجائے گی اس لیے ہمیں ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے کہ اس جماعت کی تائید اور دوستی حاصل کریں۔''(3)

مولانا آزاد کی یہ کوششیں بیکار نہ گئیں۔ جیسا کہ مولانا کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے، ان کی ان کوششوں کی بدولت ہندو انقلابیوں کے ساتھ مسلمان انقلابی آملے اور یہ سلسلہ شمالی ہندستان تک جا پہنچا، ان کی خفیہ میٹنگیں ہونے لگیں، خفیہ پروگرام ترتیب پانے لگے اور وہ بدگمانیاں دور ہونے لگیں جو ملک کے ان دو بڑے فرقوں کو ایک دوسرے کے قریب آنے سے روکتی تھیں اور بڑی حد تک غیر ملکی حکمرانوں کی حکمتِ عملی کا نتیجہ تھیں۔

1908 کے اوائل میں مولانا آزاد نے عراق، شام، ترکی اور مصر کا دورہ کیا اور وہاں کے جمہوریت پسند اور آزادی خواہ حلقوں سے تعارف اور تعلق پیدا کیا۔ اس تعارف وتعلق نے ان کے فکری اور عملی موقف کو مزید تقویت بہم پہنچائی۔ ''انڈیا ونس فریڈم'' میں لکھتے ہیں۔

''کلکتہ چھوڑنے سے پہلے میں سیاسی خیالات کے اعتبار سے انقلابی سرگرمیوں کی طرف مائلِ عمل ہو چکا تھا جب میں عراق گیا تو وہاں چند عراقی انقلابیوں سے ملاقات ہوئی۔ مصر میں مصطفےٰ کمال پاشا کے کچھ پیروؤں سے تعلقات پیدا ہوگئے۔ میں ینگ ٹرکش گروپ سے بھی ملا جس نے قاہرہ میں اپنا مرکز قائم کیا تھا اور وہاں سے ایک ہفتہ وار اخبار شائع کرتا تھا۔ جب ترکی گیا تو ینگ ٹرکش تحریک کے چند لیڈروں سے دوستی ہوگئی۔ ہندستان واپس آنے کے کئی سال بعد تک میری ان کی خط وکتابت جاری رہی۔''(4)

مہاتما گاندھی سے بھی ان کا پہلا تعارف اسی سال ہوا۔ گاندھی جی کے حادثۂ قتل کے بعد فروری 1948 میں کانسٹی ٹیوشن کلب، نئی دہلی میں ایک جلسہ اس سوال پر غور کرنے کے لیے منعقد ہوا کہ گاندھی جی کی یادگار کس شکل میں قائم کی جائے۔ جلسے کی صدارت مولانا آزاد نے کی تھی۔ صدارتی تقریر میں انھوں نے کہا تھا:

''مجھے ان (گاندھی جی) کا تعارف سب سے پہلے 1908

میں ہوا جبکہ والدِ مرحوم نے انتقال فرمایا۔ بمبئی ٹرانسوال وغیرہ میں والدِ مرحوم نمایاں حیثیت رکھتے تھے اور ان اطراف میں ان کے بہت سے مریدین اور معتقدین تھے۔ ان دنوں گاندھی جی ان اطراف کے حالات سے دل چسپی لے رہے تھے اور ٹرانسوال کانگریس کے پروگراموں میں سرگرمِ عمل تھے۔ اس وقت مجھے ایک ٹیلی گرام ملا جس کے نیچے گاندھی جی کے دستخط تھے۔ انھوں نے اس ٹیلی گرام میں والدِ مرحوم کی تعزیت کی تھی۔"(5)

یہ پہلا رابطہ شخصی نوعیت کا تھا، لیکن چند برس بعد اسی نے ہندستان کی تحریکِ آزادی کے دو عظیم رہنماؤں کے درمیان، جو اس ملک کے دو سب سے بڑے فرقوں کی نمائندگی کرتے تھے، ذہنی رفاقت اور اتحادِ عمل کی صورت اختیار کی۔ گاندھی جی ایک راسخ العقیدہ ہندو تھے اور مولانا آزاد کو اپنے صحیح العقیدہ مسلمان اور اسلامی تعلیم و تہذیب کا وارث ہونے پر ہمیشہ فخر رہا۔ لیکن دونوں ہی ملک و قوم کی اجتماعی زندگی میں حد بندیوں کے قائل نہ تھے۔ خود اس حقیقت کو سمجھتے تھے اور دوسروں کو سمجھانا چاہتے تھے کہ جس سرزمین کی آب و ہوا پر وہ جی رہے ہیں، وہاں رونما ہونے والے حالات و واقعات دونوں طرف یکساں طور پر اثر انداز ہوں گے اور اپنے اپنے تشخص کو قائم رکھتے ہوئے بھی ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے باہمی اتحاد و اعتماد ایک امرِ ناگزیر کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہی احساس تھا جسے عام کرنے کے لیے مولانا آزاد نے 1912 میں ''الہلال'' جاری کیا۔ اس اخبار کو اُردو داں طبقے بالخصوص پڑھے لکھے مسلمانوں میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی اور بہت مختصر مدت میں اس نے ہزاروں سینوں میں جذبۂ حریت کی دبی ہوئی چنگاریوں کو اس طرح ہوا دی کہ وہ شعلہ بن کر بھڑک اُٹھیں۔ ''الہلال'' کی دعوت عام تھی لیکن اس کے مخاطب اوّل مسلمان ہی تھے۔ اس کی آواز پر علما اور مشائخ کا وہ گروہ بھی جو مدرسوں اور خانقاہوں کی مقدس چار دیواریوں سے باہر قدم رکھنا کسرِ شان سمجھتا تھا، ملک و ملت پر غیر ملکی تسلط کے خلاف جد و جہد میں شرکت کی خاطر میدانِ عمل میں نکل آیا۔ مسلمانوں کی قومی غیرت اور ساتھ ہی ملی حمیت کو غفلت کی نیند سے جگانے کے لیے مولانا آزاد نے اُن پر لفظوں کے جو تازیانے برسائے اس کا کچھ اندازہ درج ذیل اقتباسات سے ہو سکتا ہے، جو ''الہلال'' کے 18 دسمبر 1912 کے شمارے سے ماخوذ ہیں:

''جو ہونے والا ہے، اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے نہیں روک سکتی۔ یقیناً ایک دن آئے گا جبکہ ہندستان کا سیاسی انقلاب ہو چکا ہوگا۔ غلامی کی بیڑیاں جو اس نے از خود اپنے پاؤں میں ڈال لی ہیں، بیسویں صدی کی ہوائے حریت کی تیغ سے کٹ کر گر چکی ہوں گی.....

فرض کرو کہ اس وقت ہندستان کی ملکی ترقی کی ایک تاریخ لکھی گئی تو تمھیں معلوم ہے کہ اس میں سات کروڑ انسانوں کی نسبت کیا لکھا ہوگا.....؟

.....اُس میں لکھا ہوگا کہ ہندستان ملکی ترقی اور ملکی آزادی کی راہ میں بڑھا اور ہندوؤں نے اس کے لیے اپنے سروں کو ہتھیلی پر رکھا مگر مسلمان غاروں میں چھپ گئے..... ملک غیر منصفانہ قوانین کا شاکی تھا۔ ہندوؤں نے اس کے لیے جہاد شروع کیا، پر اس قومِ مجاہد نے یہی نہیں کیا کہ صرف چُپ رہے، بلکہ مجنونانہ طور پر چیخ اُٹھے کہ یہ تمام کام کرنے والے باغی ہیں۔

..... آنے والا مورخ لکھے گا کہ بالآخر وہ سب کچھ ہوا جو ہونا تھا۔ بیسویں صدی میں کوئی ملک غلام نہیں رہ سکتا تھا اور نہیں رہا لیکن دنیا یاد رکھے گی کہ جو کچھ ہوا اس قوم کی سرفرازی سے ہوا جو مسلم نہ تھی۔''

یہ الفاظ جہاں مولانا آزاد مرحوم کی غیر معمولی سیاسی بصیرت کی گواہی دے رہے ہیں، وہیں اُن سے وہ غم و غصہ بھی چھلکا پڑ رہا ہے جو اپنے ہم مذہبوں میں اس بصیرت کے فقدان کے ردِ عمل کے طور پر انھیں بے چین کیے ہوئے تھا۔ یہ بے چینی وہ ایک ہندستانی کی حیثیت سے بھی محسوس کرتے تھے اور ایک مسلمان کی حیثیت سے بھی کہ ان کے نزدیک اسلام صرف خداشناسی کا پیغام نہیں خودشناسی کا درس بھی دیتا تھا۔

مولانا آزاد جدّ و جہدِ آزادی میں مسلمانوں کے جس مجہول رویّے اور برطانوی حکومت کی طرف ان کے جس جھکاؤ کے اس شدت سے شاکی تھے، اس کے لیے وہ بڑی حد تک سرسید کے اثرات کو ذمے دار گردانتے تھے۔ حکومت کی طرف سے ''الہلال'' کی ضبطی کے بعد انھوں نے 1915 میں ''البلاغ'' نکالا۔ اس میں ایک بار لکھا:

''لوگوں نے اپنی تقلید اور پرستش کا ایک نیا بُت بنایا ہے اور اس کا نام رکھا ہے 'سرسید کی پالیسی'۔۔۔ یونانی علم الاصنام میں ہر طاقت کے لیے ایک مخصوص بُت ہوتا تھا۔ یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ رزق کا دیوتا علم کے دیوتا کے کاموں میں مداخلت کرے یا کیوپڈ وینس کی حکومت میں خلل ڈالے، لیکن ان لوگوں نے صرف ایک ہی بُت بنایا ہے اور اس کے اختیارات اتنے وسیع ہیں کہ علم و عمل کا کوئی گوشہ اس سے خالی نہیں۔''(6)

یہ بات توجہ طلب ہے کہ خود مولانا آزاد کے بیان کے مطابق 1908 کے سرسری تعارف کے بعد 1918 تک انھیں گاندھی جی سے خط و کتابت کا موقع ملا

نہ ملاقات کا۔ کانسٹی ٹیوشن کلب، نئی دہلی کے جس اجتماع (فروری 1948) کا اوپر ذکر آیا، اس کی صدارتی تقریر میں یہ اعتراف موجود ہے۔ ان کے 1908 کے ٹیلی گرام کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

''اس کے بعد 1918 تک مجھے ان سے خط وکتابت یا زیارت وملاقات کا موقع نہ ملا۔ 1918 میں جب میں رانچی جیل میں نظر بند تھا..... گاندھی جی بہار کے دورے کے لیے آئے اور انھوں نے ایک شخص کے ذریعے مجھے جیل میں پیغام بھیجا کہ میں بہار آیا ہوا ہوں اور تم سے ملنا چاہتا ہوں مگر گورنر بہار نے مجھے اس کی اجازت نہیں دی۔''(7)

اسی تقریر کے مطابق گاندھی جی سے مولانا آزاد کی پہلی ملاقات مولانا کے رانچی جیل سے رہا ہوجانے کے بعد 20 جنوری 1920 کو دہلی میں حکیم اجمل خاں صاحب کے مکان پر ہوئی جہاں وہ ایک جلسے میں شرکت کرنے کے لیے آئے تھے، لیکن مولانا آزادی، جمہوریت اور غیر فرقہ وارانہ سیاست کا علم بہت پہلے بلند کرچکے تھے اور اپنے ان آدرشوں کی خاطر قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کررہے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد اپنے سیاسی فکر وعمل میں جن شخصیتوں سے متاثر ہوئے، ان میں جمال الدین افغانی اور مولانا کے مصری دوست محمد عبدہ کے نام آتے ہیں، اُن دونوں حریت پسند مفکرین کی روشن خیالی، راست گفتاری اور دُور بینی کی صفات مولانا آزاد کی شخصیت میں بھی بدرجۂ اتم دیکھی جاسکتی ہیں۔ وہ افغانی اور عبدہ سے کتنے متاثر تھے۔ اس کا کچھ اندازہ اس سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ ''الہلال'' کے پہلے ہی شمارے میں جو 13 جولائی 1912 کو شائع ہوا، مولانا نے ان دونوں کی تصویریں شائع کی تھیں۔

مولانا آزاد غالباً پہلے جلیل القدر مسلم رہنما تھے جس نے زور وقوت کے ساتھ ہندستان کی متحدہ قومیت کا تصور پیش کیا اور اسے ملک کے عوام وخواص میں رائج ورائج کرنے کے لیے اپنی تمام تر ذہنی، علمی اور استدلالی صلاحیتیں صرف کردیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ انھوں نے عالمگیر انسانی اخوت ومساوات پر بھی زور دیا اور اس سلسلے میں نہ صرف علمی اور عقلی دلائل سے کام لیا بلکہ اپنی جماعت کے مذہبی معتقدات سے بھی رجوع کیا۔ انھوں نے مسلمانوں کو یاد دلایا کہ خدا کے نزدیک ایک انسان کو دوسرے انسان پر یا ایک انسانی گروہ کو دوسرے انسانی گروہ پر کوئی برتری، کوئی فضیلت حاصل ہوسکتی ہے تو صرف اس کے صالح کردار وعمل کی بنیاد پر، دوسری کوئی بنیاد اس برتری اور فضیلت کی قائم نہیں کی جاسکتی۔ انھوں نے مسلمانوں کو یہ بھی یاد دہانی کرائی کہ جس خدا پر وہ ایمان رکھتے ہیں اس کی صفت ربّ العالمین ہے اور جس جلیل القدر پیغمبر نے اس خدا کا پیغام تم تک پہنچایا اُسے اُس نے رحمتہ للعلمین کہہ کر مخاطب کیا ہے: وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ (اے پیغمبر ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام عالموں کے لیے رحمت بنا کر)(8)

اقوامِ عالم کو پوری انسانی برادری کا حصہ قرار دینا، آج کے بڑے بڑے سیاستدانوں کا پسندیدہ مشغلہ ہے، مولانا ابوالکلام آزاد نے یہ اس وقت کہا جب رنگ ونسل کی تفریق اور ادنیٰ مفادات کے پیدا کیے ہوئے باہم متصادم نظری اور عملی اختلافات نے اس طرف متوجہ ہونے کی کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑی تھی۔ پھر اس حقیقت کو بھی نظر انداز کرنا بے انصافی ہوگی کہ موجودہ سیاسیین جب اس قسم کی مفاہمانہ باتیں کرتے ہیں تو ان کے لہجے کی سطحیت اور منافقت آلودگی صاف طور پر محسوس کی جاسکتی ہے جبکہ مولانا آزاد کی زبان پر یہ الفاظ ان کے دل ودماغ کے عمیق ترین اور شفاف ترین گوشوں سے نکل کر آئے تھے۔

مضمون ختم کرتے ہوئے میں آپ کے سامنے مولانا آزاد کے اس خطبے کا ایک اقتباس پیش کرنا چاہوں گا جو انھوں نے مارچ 1940 میں انڈین نیشنل کانگریس کے رام گڑھ اجلاس کی مسندِ صدارت سے پڑھا تھا۔ متحدہ قومیت کے تصور کو ان سے زیادہ معقول ومدلل الفاظ کا پیرایہ شاید ہی کبھی مل سکے۔ مولانا نے فرمایا تھا:

''ہماری گیارہ صدیوں کی مشترک تاریخ نے ہماری ہندستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا ہے۔ ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس، ہمارے رسم ورواج، ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتیں، کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ سکی ہو۔ ہماری بولیاں الگ الگ تھیں، مگر ہم ایک زبان بولنے لگے۔ ہمارے رسم ورواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے مگر انھوں نے مل جُل کر ایک نیا سانچہ پیدا کرلیا۔ ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پُرانی تصویروں میں دیکھا جاسکتا ہے، مگر اب وہ ہمارے جسموں پر نہیں مل سکتا۔ یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانے کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے جب ہماری یہ ملی بھلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی۔ ہم میں اگر ایسے ہندو دماغ ہیں جو چاہتے ہیں کہ ایک ہزار برس پہلے کی ہندو زندگی واپس لائیں تو انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ ایک خواب دیکھ رہے ہیں اور وہ کبھی پورا ہونے والا نہیں۔ اسی طرح اگر ایسے مسلمان دماغ موجود ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ اپنی اس گزری ہوئی تہذیب اور معاشرت کو پھر تازہ کریں جو وہ ایک ہزار برس پہلے ایران اور وسط ایشیا سے لائے

تھے تو میں اُن سے کہوں گا کہ اس خواب سے جس قدر جلد بیدار ہو جائیں بہتر ہے کیونکہ یہ ایک غیر قدرتی تخیل ہے اور حقیقت کی زمین میں ایسے خیالات اُگ نہیں سکتے.....

ہماری ایک ہزار سال کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچہ ڈھال دیا ہے۔ ایسے سانچے بنائے نہیں جاسکتے، وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔ اب یہ سانچا ڈھل چکا اور قسمت کی مہر اس پر لگ چکی۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں مگر اب ہم ایک ہندستانی قوم اور ناقابلِ تقسیم ہندستانی قوم بن چکے ہیں۔ علاحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا دے سکتا۔ ہمیں قدرت کے فیصلے پر رضامند ہونا چاہیے اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہیے۔''

بدقسمتی سے ان الفاظ کی معنویت مولانا کی زندگی میں پوری طرح نہیں سمجھی جاسکی، لیکن ان لفظوں میں پوشیدہ پیغام آج کے بدلے ہوئے حالات میں بھی ہم ہندستانیوں کے لیے اتنا ہی اہم ہے جتنا اُس وقت تھا جب یہ لفظ مولانا آزاد مرحوم کی زبان سے ادا ہوئے ہوں گے۔

حواشی:

1- مقدمہ'' خطباتِ آزاد'' شائع کردہ: ساہتیہ اکادمی نئی دہلی۔ دوسرا ایڈیشن 1981

2- بحوالہ'' ابوالکلام آزاد'' از عرش ملسیانی۔ شائع کردہ: پبلی کیشنز ڈویژن، نئی دہلی، اگست 1974

3- '' انڈیا ونس فریڈم''— اُردو ترجمہ: '' ہماری آزادی'' مترجم: پروفیسر محمد مجیب۔ ناشر: اورینٹ لونگ مین، فروری 1981

4- '' انڈیا ونس فریڈم''— اُردو ترجمہ'' ہماری آزادی''

5- '' خطباتِ آزاد'' مرتبہ: مالک رام۔

6- بحوالہ'' ابوالکلام آزاد'' از عرش ملسیانی۔

7- '' خطباتِ آزاد'' مرتبہ: مالک رام۔

8- خطبہ: '' اتحادِ اسلامی'' مشمولہ: '' خطباتِ آزاد''۔

جنوبی ہند کی تاریخ

مصنف: کے ایل نیل کنٹھ

مترجم: آر کے بھاٹاگر

جنوبی ہند کی تاریخ پر بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ کتاب میں جنوبی ہند کی قدیم تاریخ سے سترھویں صدی کے نصفِ اوّل تک کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

(دوسرا ایڈیشن)

صفحات: 576، قیمت: 114

دکنی نثر کا انتخاب

مرتبہ: سیّدہ جعفر

دکنی نثر کا یہ انتخاب دکن میں اردو نثر کی ابتدا سے فورٹ سینٹ جارج کالج کے زمانے تک کے مصنفین کا احاطہ کرتا ہے اور ان کی تصانیف کے نمائندہ منتخبات پر مشتمل ہے۔

صفحات: 168، قیمت 45

سخنورانِ گجرات

مرتب: سیّد ظہیرالدین مدنی

گجرات میں اردو شعر و ادب کی نشاندہی پندرھویں صدی کے نصف آخر سے کی جاتی ہے۔ اس کتاب میں ابتدا سے 1950 تک کے شعرا کا تذکرہ اور ان کے کلام پر تبصرہ، سیاسی اور سماجی پس منظر کے ساتھ درج ہے۔

دوسرا ایڈیشن، صفحات: 340، قیمت: 77

کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ

مرتبہ: ڈاکٹر سیّدہ جعفر

گولکنڈہ کا پانچواں تاجدار محمد قلی قطب شاہ بیک وقت کئی اوصاف سے متصف تھا۔ اس کا ایک اہم وصف شعر گوئی بھی تھا۔ یہ اس کا مستند کلیات ہے جس میں مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی شامل ہے۔

(دوسرا ایڈیشن)

صفحات: 824، قیمت: 157

قطب مشتری

مصنف: اسداللہ وجہی

'' قطب مشتری'' اردو کی ابتدائی طبع زاد مثنویوں میں کئی لحاظ سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ مثنوی متن کے ساتھ سو صفحوں پر مشتمل عالمانہ مقدمے نے کتاب کی قدر و قیمت مزید بڑھا دی ہے۔

(چوتھا ایڈیشن)

صفحات: 234، قیمت: 48

کلیاتِ سراج

سراج اورنگ آبادی

مرتب: عبدالقادر سروری

سراج اورنگ آبادی اردو کے کلاسیکل شاعروں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ دیباچے میں ان کی شاعرانہ خصوصیات اور ان کے شخصی اوصاف کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔

(دوسرا ایڈیشن)

صفحات: 732، قیمت: 138

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

انجمن آرا انجم

درسی کتب اور فرہنگ

اس میں شک نہیں کہ تدریس ایک مشکل فن ہے۔ ابلاغ کا مسئلہ اپنی تمام تر نزاکتوں اور دشواریوں کے ساتھ اس فن کی گہرائیوں میں پیوست ہے۔ مدرس یا استاد کس طرح ایک خاص معیار کے طالب علموں کے ذہن و شعور میں اس موضوع کو جسے وہ پڑھا رہا ہے، اس طرح پیوست کردے کہ زیرِ بحث موضوع طالب علم کے لیے آئینہ ہوجائے اور وہ اس معیار تک اٹھ سکے جہاں تک استاد اسے اٹھانا چاہتا ہے، مہارتِ فن کا طالب ہے۔ اس سلسلے میں اس کا سب سے اہم وسیلہ اور ذریعہ وہ ہے جسے درسی کتاب یا نصابِ درس کہا جاتا ہے۔ درسی کتاب جتنی فنی مہارت سے تیار کی گئی ہو، اسی نسبت سے استاد کا کام آسان یا مشکل ہوجاتا ہے۔ ادب کے بارے میں درسی کتاب کی تیاری کچھ اور ہی زیادہ شعور فن کے مظاہرے کی طلب گار ہے کیوں کہ ادبی شعور کو بیدار کرنا، اس کی آبیاری کرنا، زبان و بیان کی نزاکتوں سے آگاہ کرنا، ادب سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت پیدا کرنا اور یہ سارے کام اس معیار کو مدِ نظر رکھ کر کرنا جس معیار کے طالب علموں کے لیے وہ کتابیں تیار کی جارہی ہیں، ادب پر، خواہ وہ کلاسیکی ہو یا جدید، گہری نظر رکھے بغیر اس فریضے کی انجام دہی بے حد مشکل ہے۔ لیکن یہ کام جتنی چابک دستی یا مہارت سے انجام دیا جاسکے گا اتنا ہی درسی کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوتا جائے گا اور ایک مدرس تدریس کی ذمے داریوں سے اتنے ہی موثر طریقے سے عہدہ برآ ہو سکے گا گویا تدریسی کتب کی تیاری متون سے استفادے کا، چاہے وہ نثری ہوں یا شعری، اوّلین اور اہم ترین قدم ہے۔

اس تلخ حقیقت کا اظہار اور اقرار کیے بغیر چارہ نہیں کہ یہ پہلا قدم یعنی درسی کتب کی تالیف جتنی ذمے داری، بالغ نظری اور تربیت یافتہ ادبی ذوق کی طلب گار ہے اتنی ہی زیادہ اس کی طرف سے لاپرواہی برتی جاتی ہے اور سب سے آسان کام درسی کتاب کی تالیف ہی کو سمجھا جاتا ہے۔ زبان سے خواہ یہ نہ کہا جائے لیکن عمل سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ اردو ادب کی درسی کتاب کی تیاری ایک سیدھے سادے فارمولے کے تحت انجام پاتی ہے۔ متقدمین، متوسطین اور متاخرین و معاصرین کی نثری یا شعری تالیفات سے اقتباسات جمع کرکے زیادہ سے زیادہ زمانی ترتیب کے ساتھ انھیں پیش کردینا۔ یہ خلاصہ ہے ادب کی کسی درسی کتاب کی تالیف کے اصل الاصول کا۔

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر نثری اور شعری متون کے ان اقتباسات کے مجموعوں کی تدریس جنھیں درسی کتب یا نصابی کتب کا نام دیا جاتا ہے اور زیادہ مشکل بلکہ پیچیدہ مسئلہ بن کر رہ گئی ہے۔ مزید برآں اگر ہم اس مسئلے کو عام تہذیبی، تعلیمی اور علمی تناظر میں دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ محض ایک تدریسی یا تعلیمی مسئلہ نہیں ہے بلکہ ایسا پیچ در پیچ مسئلہ ہے جس کے کئی پہلو ہیں جن میں سے بعض حسب ذیل ہیں۔

1- علمی معیار برابر گرتا چلا جارہا ہے۔ جہاں تک اردو ادب کے مطالعے اور تدریس کا تعلق ہے یہ کہنا حقیقت سے بعید نہیں کہ بہت سادہ مواد جو کبھی ہائی اسکول کے معیار کا سمجھا جاتا تھا، آج وہ بی.اے اور ایم.اے کے متنی اقتباسات میں شامل نظر آتا ہے۔

2- یہ حقیقت ناقابلِ تردید ہے کہ اردو زبان و ادب کے الفاظ کا بڑا ذخیرہ عربی اور فارسی سے لیا گیا ہے۔ اب سے کچھ عرصے پہلے تک فارسی کا مطالعہ باقاعدہ نصاب کا حصہ ہوتا تھا اور عربی کے معتدبہ الفاظ سے طالب علم کو واقفیت ہوجاتی تھی۔ آج عربی زبان تو بعد کی چیز ہے، فارسی الفاظ کے ذخیرے پر بھی طالب علم تو کیا استاد کی نظر نہیں ہوتی۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ معیاری اردو شعر و نثر میں استعمال ہونے والی زبان کے اکثر الفاظ کے صحیح مفہوم و معنی سے بے گانگی عام بات ہے، حتیٰ کہ ان الفاظ کے صحیح تلفظ سے بھی بیگانگی عام ہوتی جارہی ہے۔ اردو کے اکثر اساتذہ اس ذخیرۂ الفاظ کے استعمال پر تحریر ہو یا تقریر قدرت نہیں رکھتے اور جب صورتِ حال یہ ہو تو اس کی کیا توقع کی جائے کہ وہ طالب علموں کو ان کے معنی و مفہوم، صحیح تلفظ، ان کے معانی کے فرق اور عبارت میں ان کے استعمال کی نزاکتوں اور طرزِ بیان کی لطافتوں سے آگاہی بخش سکیں گے، بالخصوص وہ حضرات جن کے سپرد ہائی اسکول تک کے درجات میں اردو تدریس کی ذمے داریاں ہیں۔ چنانچہ ہائی اسکول کے بعد بھی طالب علم اس لائق نہیں ہوپاتا کہ اچھی نہ سہی، صحیح اردو ہی لکھ، بول اور پڑھ سکے۔ میں یہ عرض کردوں کہ آسان اور سہل زبان سیکھنے سکھانے کی ساری وکالت اس جگہ آکر دم توڑ دیتی ہے کہ اس زمانے میں بھی ہمارے جتنے صاحبِ اسلوب ادیب اور شعرا ہیں اور جو زبان و بیان پر قدرت رکھتے ہیں اور اچھی اور معیاری زبان لکھنے والے کہے جاتے ہیں، ان سب کا درسی یا مطالعاتی پس منظر فارسی اور عربی الفاظ کی رنگارنگی سے پُر نظر آتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ درسی کتابوں کا مواد چونکہ شعری و نثری متون سے حاصل کیا جاتا ہے اور یہ متون اکثر و بیشتر غیر تحقیقی ایڈیشنوں کی شکل میں طبع ہوتے ہیں اس لیے وہ ساری غلطیاں خواہ وہ رسمِ خط سے متعلق ہوں، املا سے، ضبطِ حرکات سے یا کتابت و طباعت کی رہینِ منت ہوں مجسمہ مع کتابت و طباعت کی مزید غلطیوں کے درسی کتاب کی زینت بنتی ہیں اور طالب علم کی

گمراہی اور کم مایہ استاد کی پریشانی و غلط فہمی کا سبب بنتی ہیں۔ خصوصاً اس وقت جب کہ درسی کتاب کے مرتب کی حیثیت سے سرورق پر کسی بھاری بھرکم شخصیت کا نام بھی نظر آتا ہو، یہ توقع کرنا کہ استاد یا طالب علم اس طرح کی غلطیوں کی تصحیح خود کرسکیں گے، امید موہوم ہے۔

پتہ نہیں کیوں درسی کتاب کی تصحیح کی طرف سے بالعموم غفلت برتی جاتی ہے۔ ہر طرح کی غلطیاں خواہ وہ مرتب کتاب کی لاپروائی کی رہین منت ہوں یا کاتب، طابع یا ناشر کی دست درازیوں کا نتیجہ ہوں، درسی کتاب میں مل جائیں گی۔ وہ لوگ جو بالخصوص بی۔ اے کے معیار تک کی درسی کتابیں پڑھانے کا تھوڑا سا بھی تجربہ رکھتے ہیں، اس افسوس ناک کوتاہی اور اس سے پیدا شدہ تکلیف دہ صورت حال کی تصدیق کریں گے۔

درسی کتابیں اصل نثری یا شعری متون کے نمونوں کی پیشکش کے ذریعے خود ان متون تک پہنچنے کا ذریعہ اور وسیلہ ہوتی ہیں مگر کیا ان مذکورہ امور کے پیش نظر اس بات کی کوئی امید کی جاسکتی ہے کہ ان سے مطلوبہ نتائج برآمد ہوسکیں اور طلبہ میں اردو شعر و ادب کا اچھا ذوق پیدا ہوسکے؟ موجودہ صورت حال میں اردو کے شعری اور نثری متون کی مؤثر تدریس اور ان سے استفادے نیز ادبی ذوق پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ درسی کتابوں کی تیاری میں مندرجۂ ذیل امور کو ملحوظ رکھا جائے اور مرتب کتاب اس بات کا بھی خیال رکھے کہ درسی کتاب کس معیار اور کس درجے کے طلبہ کے لیے مرتب کی جارہی ہے۔

1- قدیم کلاسیکی متون سے اقتباس لیتے ہوئے خواہ ان کا تعلق نثر سے ہو یا شعر سے اس بات پر خصوصی توجہ دی جائے کہ جو اقتباس درج کتاب کیا جارہا ہے اس کی عبارت اور الفاظ کی تصحیح کردی جائے، خصوصاً اس صورت میں جب کہ وہ غیر تحقیقی ایڈیشن سے لیا جارہا ہے۔ حالانکہ تحقیقی ایڈیشنوں کی حالت بھی بالعموم کچھ زیادہ بہتر نہیں ہے۔

2- ان اقتباسات میں زمانی ترتیب کا لحاظ رکھا جائے۔

3- مشکل الفاظ کے معنی بتائے جائیں۔ الفاظ کے مشکل یا سہل ہونے کا معیار اس درجے کے طالب علموں کی ذہنی، علمی اور ادبی سطح کو پیش نظر رکھتے ہوئے طے کیا جائے اور ان کی صلاحیت کو ابھارا جائے۔

4- نامانوس اور متروک الفاظ کا مطلب اور مفہوم لازماً فراہم کیا جائے۔

5- ایسے الفاظ کی تشریح ضرور دی جائے جن کے مفہوم میں زمانے کے ساتھ تغیر ہوگیا ہے۔

6- اگر ایسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو اپنا کوئی تہذیبی پس منظر رکھتے ہیں تو اسے درج کیا جائے تاکہ ان کا پورا مفہوم واضح ہوسکے۔

7- لغوی اور مجازی معنی دونوں فراہم کیے جائیں بالخصوص جب وہ لفظ کسی ایک معنی کے ساتھ خاص ہوکر رہ گیا ہو۔

8- الفاظ کی اصلیت کو ظاہر کیا جائے کہ عربی ہے یا فارسی، ترکی ہے یا ہندی یا کسی اور زبان کا۔

9- ایسے الفاظ پر پابندی سے اعراب لگائے جائیں جن کا تلفظ بالعموم غلط کیا جاتا ہے یا جن کے تلفظ میں التباس ہوتا ہے، یا جو نامانوس یا متروک ہیں یا جو کسی دوسری زبان کے ہیں یا اصل زبان میں ان کا تلفظ اردو تلفظ سے مختلف ہے۔ عربی عبارتوں پر لازماً اعراب لگائے جائیں اور عربی، فارسی عبارتوں اور اشعار کا ترجمہ دیا جائے اور ان کی معنویت پر روشنی ڈالی جائے۔

10- الفاظ کا املا صحیح اور معیاری ہو۔

11- اضافتوں کو علامات کے ذریعے واضح کیا جائے تاکہ عبارت کا مطلب واضح طور پر سمجھ میں آسکے۔

12- تلمیحات، تشبیہات اور استعارات کی تشریح کی جائے اور ان کے ادبی محاسن کو واضح کیا جائے نیز لفظی اور معنوی صنائع کی تشریح کرتے ہوئے ان کے محاسن پر روشنی ڈالی جائے۔

13- جس مصنف، نثر نگار یا ناظم کے یہاں سے اقتباس لیا گیا ہے اس کے مختصر حالات زندگی مع اس کے طرز تحریر کی خصوصیات کے دے دیے جائیں تاکہ تحریر کے ساتھ صاحب تحریر سے بھی واقفیت ہوجائے۔

14- مذکورہ تشریحات کے لیے معیاری زبان استعمال کی جائے، جو زبان و بیان کی غلطیوں سے پاک ہو۔

15- کتابت و طباعت معیاری اور غلطیوں سے پاک ہو۔

درسی کتاب کے مرتب کو یہ چند امور ذہن نشیں رکھنا چاہیے۔ ان پندرہ امور میں سے آخری دو کے علاوہ سب وہ ہیں جن کا تعلق بلا واسطہ یا بالواسطہ درسی کتاب کے ساتھ بحیثیت مجموعی یا ہر سبق کے اخیر میں فرہنگ فراہم کرنے سے ہے۔ لفظ فرہنگ کا استعمال صرف الفاظ کے معنی لکھ دینے کے تنگ مفہوم کے بجائے، وسیع تر مفہوم میں کیا جارہا ہے جس میں ضبط الفاظ، تلفظ، معنی کے فرق، ان کی اصلیت اور تغیرات لفظی و معنوی، املا اور ادبی محاسن سبھی کچھ شامل ہیں۔ ہمارے اس خیال سے یہ بھی واضح ہوگیا ہوگا کہ فرہنگ کی فراہمی درسی کتاب کی ترتیب و تالیف کے لیے، جو بجائے خود اصل نثری اور شعری متون تک رسائی کے زینے کی حیثیت رکھتی ہے، بنیادی پتھر کی مانند ہے جس کے بغیر ادبی ذوق کی کشت کاری اور آبیاری ہوا میں محل تعمیر کرنے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔

یہ تو تھی اصولی بات، جس سے درسی کتابوں کی فرہنگ کی افادیت اور اہمیت

واضح ہوتی ہے۔ اب ہم بعض درسی کتابوں سے مثالیں دے کر اپنے دلائل کے عملی شواہد پیش کرتے ہیں۔

ہمارے پیشِ نظر دو کتابیں ہیں۔ ایک ''نثرِ اردو'' برائے بی۔اے اور دوسری ''انتخابِ اردو شاعری 1920 تک'' یہ دونوں کتابیں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں بی۔اے آنرز کے سالِ اوّل میں پڑھائی جاتی ہیں۔ ان دونوں درسی کتابوں کی خصوصیت یہ ہے کہ محض اقتباسات کے مجموعے ہیں جو فی الجملہ تاریخی ترتیب پر مرتب کیے گئے ہیں اور اقتباسات کے علاوہ بقیہ امور سے پہلوتہی کی گئی ہے، جس سے متوسط درجے کے مدرس کو تدریس میں اور طالب علم کو زبان کے علم میں اضافہ اور ذوقِ ادب کی بالیدگی کا کوئی سامان بہم نہیں پہنچتا۔ چنانچہ مختصر طور سے ان دونوں کتابوں کے بارے میں چند معروضات پیش کرتے ہوئے کچھ مشکل الفاظ کی نشان دہی بھی کردی گئی ہے۔

نثرِ اردو کو لیجیے۔ ''سوال کرنے کی'' (ملاوجہی) میں دکنی زبان کے الفاظ، محاورے اور ضرب الامثال کے معنی و مفہوم تک پہنچنا تو کجا، استاد کے لیے عبارت کا صحیح پڑھنا، جب اعراب بھی نہ لگے ہوں، کسی مہم کو سر کرنے سے کم نہیں ہے۔ بچارے طالب علم کے لیے اس مرحلے سے گزرنا کتنا دشوار کن اور محال ہے، اس کا اندازہ آسانی سے لگایا جاسکتا ہے۔

''بندر کی تقریر'' (رجب علی بیگ سرور) جو مسجع مقفی زبان اور اضافتوں سے مزین ہے اور جس میں صرف تین چار جگہ ہی اضافت لگائی گئی ہے۔ ایسی صورت میں ایک استاد سے بھی عبارت صحیح پڑھنے کی توقع نہیں کی جاسکتی ہے۔ بچارہ طالب علم تو اس بحرِ ذخار میں غوطے ہی لگاتا رہے گا۔

معاملاتِ قضا و قدر، مسئلۂ جبر و اختیار، فرعونِ بے سامان، ادہی یا محمودی، بسیر، قاقم، شطرنجی، سریع السیر، تہتیس جرار (کاتب کی چیرہ دستی نے تہمتن کو تہتیس بنادیا) نفسِ لتارہ کے علاوہ فارسی کے یہ اشعار:

نیم شبے آہ زند پیر زال
دولتِ صد سالہ کند پائمال
اسپ تازی شدہ مجروح بزیرِ پالاں
طوقِ زرّیں ہمہ در گردنِ خری بینم

ایسے ہیں کہ بغیر فرہنگ کے انھیں سمجھنا طالب علم کے لیے ممکن ہی نہیں ہے۔ استاد بھی اپنی ذمے داری سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا ہے۔ مسئلہ جب غالب کے خطوط کا ہو تو فرہنگ کے بغیر استاد کی رسائی خطوط کے مطالب و مفاہیم اور ان کے ادبی محاسن تک کیسے ممکن ہے اور وہ کس طرح طالب علم کو ان کی معنوی خوبیوں سے واقف کراسکتا ہے۔

روانہ ہونا شہزادے اور ملکہ کا (محمد عطا حسین خاں تحسین) صاحب مروّت و معدنِ فتوت۔ عاطل۔ سالما و غانما۔ جلوداری۔ والدین مخدوم نشاتین۔ معتصم بہ عروۃ الوثقا وغیرہ۔

چاہِ زمرد کا میلہ (احمد حسین جاہ)۔ مقابہ۔ کشمیر۔ سالجھاں۔ گنگا جمنی۔ چھینٹے۔ یارقند۔ کلوار۔ علاقہ بند۔ تھسے باندھنا۔ قیلون وغیرہ۔

صوبۂ خوش سواد الہ آباد (میر شیر علی افسوس) خوش سواد۔ کمر۔ جذمی۔ صوری و معنوی۔ عباسی۔ نقش بندی۔ لالی پند و نصائح۔ معقولات۔ منقولات۔ اماکنِ مشرفہ۔ محوطہ۔ ثقافت وغیرہ۔

میر تقی میر (سعادت خاں ناصر)۔ استیلا۔ مثلِ من دیگرے نیست۔ فضلنا بعضکم علیٰ بعض۔ ہر عیب کہ سلطاں بہ پسندد ہنر است۔ کدخدا وغیرہ۔

کیا مذکورہ بالا مختلف اسباق کے الفاظ (بغیر اعراب) کے صحیح تلفظ اور ان کے معنی سے آگاہی فرہنگ کی عدم موجودگی میں استاد اور طالب علم دونوں کے لیے ممکن ہے اور کیا وہ اپنی اپنی ذمے داری خوش اسلوبی سے انجام دینے کے اہل ہوسکتے ہیں؟

شعری مجموعے میں جو ''انتخابِ اردو شاعری'' سے موسوم ہے، یہی صورت حال نظر آتی ہے۔ محمد قلی قطب شاہ یا ولی یا سراج کا بغیر فرہنگ کے پڑھنا اور سمجھنا بے حد مشکل ہے۔ غالب، مومن، سودا اور ذوق کے کلام سے لطف اندوزی تو بعد کی چیز ہے، سحر البیان جیسی مثنوی میں جب اس طرح کے الفاظ آئیں تو بغیر فرہنگ کے مدرس کیسے سمجھے اور کیا سمجھائے۔ ڈیڑھ ہے۔ پنیری۔ عروس الخطوط۔ ثلث۔ رقاع۔ نسخ۔ ریحان۔ خطِ غبار۔ خطِ گلزار اور خطِ شعاع وغیرہ، اور جب معاملہ قصائد اور مراثی سے آپڑے تو استاد فرہنگ کا ایسا ہی محتاج ہوتا ہے جیسے نابینا لاٹھی کا۔

خلاصۂ بحث یہ کہ درسی کتب کے لیے فرہنگ بے حد ضروری ہے۔ فرہنگ کے بغیر درسی کتاب ایک ایسا طلسم بن کر رہ جاتی ہے جس کی لوح گم ہوگئی ہو۔ درسی کتاب جو نثری اور شعری متون سے استفادے کی راہ ہموار کرتی ہے، جو نثری اور شعری خزینوں کی کنجی کی حیثیت رکھتی ہے، جو نثر و شعر کا ذوق پیدا کرنے کا اوّلین ذریعہ اور وسیلہ ہے، بغیر ایک اچھی فرہنگ کے نہ صرف طالب علم کے لیے بلکہ استاد کے لیے بھی اپنی تمام تر افادیت کھودیتی ہے۔ لہٰذا آئندہ جو بھی درسی کتب تیار کی جائیں ان میں فرہنگ کے وسیع تر مفہوم کو مدِ نظر رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ استاد بھی اپنے تدریسی فرائض دیانت داری سے اور بخوبی انجام دے سکے اور طالب علم الفاظ کے صحیح تلفظ اور معنی، زبان و بیان کی باریکیوں اور ادبی محاسن سے بہرہ ور اور فیض یاب ہوسکے۔

□□□

Hareem, Near Jattari House, Dodhpur,
Aligarh-202002

حمید اللہ صدیقی

طلبہ میں ذوقِ مطالعہ کا فروغ

تعلیم وتعلم ایک مسلسل اور تا حیات عمل ہے۔ ہمارے یہاں باضابطہ تعلیم پری نرسری سے یونیورسٹی تک محیط ہے۔ اس مروجہ نظامِ تعلیم کی ہر سطح پر طلبہ کا دائرہ مطالعہ چند مجوزہ درسی کتب اور کلاس روم لیکچروں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ بہت کم ہی طلبہ اس دائرے سے باہر نکل کر مزید جانکاری اور وسعتِ نظر پیدا کرنے کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں جس کی وجہ سے طلبہ خام اور غیر معیاری رہ جاتے ہیں اور ان میں سے اکثر حقیقی زندگی کے چیلنجز کا مقابلہ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔

ابتدائی اور ثانوی سطح کے طالب علموں میں مطالعے کے رجحان کو فروغ دینے میں اساتذہ کا بڑا ہی اہم اور مؤثر کردار ہے۔ نشوونما کے دور سے گزرنے والے نوخیز ذہنوں میں شوقِ مطالعہ پیدا کرنے کی ذمے داری انھی پر ہے۔ ایک بار جب ان نوخیز ذہنوں میں حقیقت پسندانہ اور بارآور مطالعہ کا شغف پیدا ہو گیا تو اعلا سطح پر پہنچ کر یہ مزید پروان چڑھے گا اور بہت ہی بارآور ثابت ہوگا۔

ہمارے موجودہ تعلیمی نظام میں بہت سارے ایسے عناصر ہیں جو طلبہ کے اندر مطالعۂ کتب کے فروغ اور لائبریری سے استفادے کی راہ میں حائل ہیں۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں رائج کورسیز کا ڈھانچہ، کلاس روم پر مرکوز طرزِ تعلیم اور درسی کتب پر مشتمل امتحانات کا نظام وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جو ایک طالب علم کو کسی بھی طرح مزید مطالعے کی طرف راغب نہیں کرتی ہیں۔ سیکھنے اور سکھانے کا عمل کلاس کی چہار دیواری میں مقید لیکچروں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ نظامِ تعلیم اسائنمنٹس، پروجیکٹ ورکس اور سمینار وغیرہ کے مواقع نہیں فراہم کرتا جس کے ذریعے تعلیمی سال کے دوران طلبہ کی صلاحیتوں اور قابلیتوں کا ایک تسلسل اور باقاعدگی سے جائزہ لیا جاسکے۔ طلبہ کی صلاحیتوں کا اندازہ صرف سال کے آخر میں ہونے والے امتحانات پر منحصر ہوتا ہے۔ طلبہ کلاس میں دیے گئے لیکچروں کے پرانے نوٹس اور بازار میں دستیاب سستی گائڈوں کا سہارا لیتے ہیں جو ان کے لیے امتحانات میں کامیابی کا بڑا ہی سہل ذریعہ ثابت ہوتی ہیں اور نتیجتاً وہ کتب خانے میں موجود بیش قیمت کتابوں کی طرف توجہ کرنے کی زحمت نہیں کرتے۔

صحت مند ذوقِ مطالعہ کے فروغ ورواج کے لیے کلاس روم پر مرکوز طرزِ تعلیم کے بجائے کتب خانے پر مرکوز طرزِ تعلیم وتعلم کو نافذ کرنے کی ضرورت ہے۔ جس میں استاد ایک گائڈ کا کردار ادا کرے۔ لیکچروں کی تعداد کم سے کم ہو، سمینار، پروجیکٹ ورکس اور اسائنمنٹس زیادہ سے زیادہ بطور کورس شامل ہوں۔ امتحانات میں بھی لائبریری ورکس کو زیادہ اہمیت دینی ہوگی۔ سال کے آخر میں ہونے والے امتحانات کے بجائے سمسٹر سسٹم کے ذریعے باقاعدگی سے صلاحیتوں کا تعین کیا جائے تو کتب خانے کی سہولیات کا استعمال زیادہ تیزی سے بڑھے گا۔

کتب خانوں پر مرکوز طرزِ تعلیم میں لائبریری اور اس کے عملے کا رول بھی کافی اہم ہو جاتا ہے۔ لائبریری میں موجود بے شمار کتابوں میں سے موزوں، کارآمد اور ضروری مواد کو ڈھونڈ نکالنے میں طلبہ کی رہنمائی کرنا، اساتذہ اور طلبہ کی مختلف النوع ضروریات کو مدِنظر رکھتے ہوئے لائبریری کو تمام ضروری اور جدید ساز وسامان سے لیس کرنا، پوری یونیورسٹی یا کالج برادری کے تعلیم وتعلم اور ریسرچ کے کاموں میں معاون ہونا ان کی ذمے داری ہے۔ کتب خانے کو ضروری اور جدید Biblographic Tools سے پوری طرح لیس ہونا چاہیے جو کتابوں کے بارے میں تمام ضروری تفصیلات مہیا کرائیں۔ اس اطلاعاتی دور میں ایک لائبریری بغیر انٹرنیٹ اور Online Publication Access Catalogue (OLPAC) کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ لائبریری کا Reference Section بھی پوری طرح مربوط ومنظم ہونا چاہیے اور اس کا نظم ونسق قابل اور تجربہ کار ماہرین کے سپرد ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ خاص مواقع پر موجودہ حالات کے تعلق سے سمینار، سمپوزیم اور Book Talks وغیرہ کا انتظام ہونا چاہیے۔ وقتاً فوقتاً Users Study کا اہتمام کرکے طلبہ اور اساتذہ کی مختلف النوع ضروریات کا جائزہ لیتے رہنا اور ان کی تکمیل کرنا بھی طلبہ کے اندر مطالعے کے رجحان کو بڑھانے اور لائبریری کے ذخیرے میں متوازن اور کارآمد اضافے کے لیے کافی اہم ہے۔

اطلاعاتی دھماکے کے اس دور میں لائبریری اور دوسرے علمی ذرائع کے استعمال کی جانکاری بھی بہت اہم ہے۔ یہ ان اسٹاف اور طلبہ کے لیے اور بھی ضروری ہو جاتا ہے جو ابھی ابھی اعلا تعلیمی مراکز سے منسلک ہوتے ہوں۔ انھیں ثانوی سطح پر یا کالج کی سطح پر بہت زیادہ لائبریری سے استفادے کا موقع نہیں ملا ہوتا ہے۔ Users Education کے ذریعے ان طلبہ کو Catalogue کا استعمال، کلاسیفکیشن اسکیم، لائبریری کے مختلف ڈویژنس

اور ان کے استعمال کی ہدایات، ان کا کلکشن اور اس میں مہیا سہولیات کی جانکاری فراہم کی جاسکتی ہے جس سے ان میں مطالعے کا فطری رجحان اور ذوق بہت حد تک بڑھے گا۔

طلبہ میں ذوقِ مطالعہ کو بڑھانے میں مصنفین کا بھی بڑا اہم رول ہے۔ وہ ایسی کتابیں تصنیف کریں جو طلبہ کی شخصیت کی تعمیر اور ان کے علم میں اضافے کا سبب بن سکیں۔ کتابوں اور مقالہ جات کے فکری مواد کا معیاری، حقیقت پسندانہ، غیر متعصب اور اپ ٹو ڈیٹ ہونا کافی اہم ہے۔ انداز بیان واضح اور شفاف ہو، تاکہ مواد تک رسائی بہ آسانی ہو سکے۔ مصنفین اور بطور خاص مصنفین کو گائڈ بکس لکھنے سے احتراز کرنا چاہیے کیونکہ یہ طلبہ کے ذوقِ مطالعہ پر کافی منفی اثرات مرتب کرتی ہیں۔

کسی بھی ملک کے تعلیمی نظام اور اس کے معیار پر ناشرین حضرات کا بھی غیر معمولی اثر پڑتا ہے۔ انھیں ان مصنفین کی ہمت افزائی کرنی چاہیے جو طلبہ کی ضروریات کے مطابق اچھے اور معیاری مواد مہیا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ انھیں صرف درسی کتب کی ہی نہیں بلکہ مختلف مضامین کی حوالہ جاتی کتابوں کی بھی نشر و اشاعت میں دل چسپی دکھانی چاہیے تاکہ طلبہ کی علمی بنیادیں مضبوط ہوں۔ کم قیمت پر درسی اور حوالہ جاتی کتب کی اشاعت جو کہ طلبہ برادری کے ایک بڑے حصے تک پہنچ سکے، ذوقِ مطالعہ کے فروغ میں بہت اہم کردار ادا کرسکتی ہے۔ موجودہ ملکی اور غیر ملکی کتابوں کی قیمتوں کے تعین کا نظام ان لوگوں پر کافی منفی اور مایوس کن اثرات مرتب کر رہا ہے جو کتابوں کو نجی استعمال کے لیے خریدنا چاہتے ہیں۔ ملکی ناشرین کو ایک بہتر اور مستحکم منصوبہ تیار کرنا پڑے گا جس کے ذریعے کم سے کم قیمت پر طلبہ اور اساتذہ کے لیے درسی اور حوالہ جاتی کتب فراہم ہو سکیں۔

مطالعۂ کتب ایک تعلیم یافتہ آدمی کی اہم ضرورت ہے اور طلبہ کے لیے اس کی اہمیت اس مسابقت کے دور میں اور بڑھ گئی ہے۔ مختلف قسم کے مواد کا مطالعہ کرنے سے زاویۂ نظر میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور ایک مضبوط ذہنی بنیاد کی تعمیر ہوتی ہے۔ کتابوں کا مطالعہ ہماری قومی شناخت ہونا چاہیے اور اس کی شبیہ ہماری نشر و اشاعت کے نظام میں منعکس ہونی چاہیے اور یہ اس وقت ممکن ہے جب نظامِ تعلیم میں تبدیلی لاکر طلبہ کے اندر ذوقِ مطالعہ کی جس کو بیدار کیا جائے اور ضروری اصلاحات کے ذریعے اس کو مہمیز دی جائے۔ یہ عمل ایک مکمل اور مسلسل سعی ہے جس کے لیے والدین، اساتذہ، مصنفین اور ناشرین ہر ایک کو اپنا کردار پوری ذمے داری اور دیانت داری سے ادا کرنا ہوگا۔

□□□

A-48, Taimur Nagar, New Delhi-110025

اہلِ اردو کے دیرینہ خوابوں کی تعبیر

اردو انسائیکلوپیڈیا

جو بین الاقوامی معیار کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا ہے

32 علوم پر مشتمل تین کلیدی جلدیں شائع ہو گئیں

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اردو میں پہلا مکمل اور بین الاقوامی معیار کا انسائیکلوپیڈیا شائع کیا ہے۔ ابتدائی تین جلدیں 32 علوم پر مشتمل ہیں۔ جملہ علوم پر مختصر نوشتے آٹھ جلدوں میں شائع کیے جائیں گے۔

سارا مواد بڑی دیدہ ریزی اور مشقت کے ساتھ سلیس زبان اور دلنشیں پیرایے میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایسی کاوش ہے جو آئندہ کئی نسلوں کو علم و دانش سے مالا مال کرتی رہے گی۔ ادیبوں، صحافیوں، طلبہ اور علم دوست قارئین کے لیے ایک نادر تحفہ، ہر جلد اپنے آپ میں مکمل ہے۔

جلد اوّل، 578 صفحات، قیمت-/300 روپے۔ جلد دوم، 568 صفحات، قیمت-/450 روپے۔ جلد سوم، 614 صفحات، قیمت-/450 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

احمد طارق

ادیب اور عہدِ حاضر کے مسائل

عہدِ حاضر کے سنگین مسائل ہمارے لیے ایک چیلنج ہیں۔ قومی اور بین الاقوامی سطح پر جس طرح برق رفتاری سے تبدیلیاں رونما ہورہی ہیں۔ ان کے اثرات براہِ راست ہمارے سماج اور تہذیب کو متاثر کررہے ہیں— ان اثرات کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھا جارہا ہے اور ان کی معنویت اور افادیت پر سوالیہ نشان قائم کیے جارہے ہیں۔ ایسے حالات میں ادیبوں کو خلوص اور ایمانداری کے ساتھ سماج کے تئیں اپنے فرائض کو ادا کرنا پڑے گا۔ عہدِ حاضر کے ادیبوں کو جن مسائل کا سامنا ہے وہ اتنے پیچیدہ ہیں کہ تاریخ کے کسی موڑ پر ادیبوں کو ان سے نبرد آزما نہیں ہونا پڑا۔ لہٰذا عہدِ حاضر کے ادیبوں کو اپنی بصیرت سے کام لے کر درپیش مسائل کے سدِ باب کے لیے لائحۂ عمل مرتب کرنا پڑے گا۔

گذشتہ تین چار دہائیوں میں سائنسی ترقیوں کے طفیل تہذیب و سماج کے سانچوں میں ایسی ہوشربا تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں جنھوں نے ہزارہا برس کے انسانی تہذیبی سفر پر سوالیہ نشان کھڑے کردیے ہیں۔ ان دہائیوں میں مادی ترقی کی بے شمار منزلیں چشم زدن میں طے کرنے والے انسان نے اپنی مجنونانہ حرکتوں سے قدرت کی اس حسین دنیا کو کئی مرتبہ نیست و نابود کیا ہے۔ انسان کا اپنی دنیا اور سماج کو خوب سے خوب تر بنانے کا دیرینہ خواب خاک میں مل چکا ہے۔ آج انسان ہی انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ فطرت کی خوفناک قوتوں پر فتح حاصل کرنے والے انسان نے انسانیت کے تقدس کو پامال کرکے رکھ دیا ہے۔ اس کی نظر میں اعلا آدرشوں اور روایتوں کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہی۔ 1945 میں جاپان پر ایٹم بم گرانے والا انسان اس لمحے اپنے ہم جنسوں کی ہلاکت پر شیطان کے بالمقابل کھڑا قہقہے لگا رہا تھا۔ تہذیبی ارتقا کی ہزارہا برس کی تاریخ میں وہ ایسا قیامت خیز لمحہ تھا جس کے خوف سے آج تک انسان آزاد نہیں ہوسکا ہے۔ آج یہ خطرہ پہلے سے زیادہ خوفناک صورتوں میں ہمارے سامنے موجود ہے۔

دراصل 1945 کے بعد ہی دنیا میں ایسی برق رفتاری سے تبدیلیاں رونما ہوئیں کہ ایک حساس شخص آج زندگی کے دوراہے پر انگشت بدنداں، حیران و پریشان کھڑا ہے۔ سائنسی ترقیوں کے طفیل انسان نے 50 کی دہائی کے اواخر میں خلا کی لامحدود وسعتوں میں قدم رکھا تو اس کے تخیل کو گویا پر لگ گئے۔ 1969 میں اس نے چاند پر کمندیں ڈال کر اپنے پرکھوں کے دیرینہ خواب کی تعبیر حاصل کی اور اس کے بعد اس سے آگے کے سفر کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ آج انسان کے بنائے ہوئے مصنوعی سیارے خلا میں قدرت کے اسرار کی نقاب کشائی کررہے ہیں۔ دوسری جانب زمین پر صبا رفتار سواریوں اور ہوائی جہازوں نے جغرافیائی سرحدوں کو توڑ کر رکھ دیا ہے۔ اس کے علاوہ فون، سیل فون، ٹی۔وی۔ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ وغیرہ یعنی انفارمیشن ٹیکنالوجی کی ترقیوں کے طفیل سہولیات نے ماضی کی اس پراسرار دنیا کو ایک چھوٹے سے Global Village میں تبدیل کرکے رکھ دیا ہے۔ جغرافیائی سرحدوں کے ٹوٹنے سے تہذیبوں کے مابین باہم میل جول کے بجائے انتشار اور کشمکش کی ایک عجیب صورت پیدا ہوگئی ہے۔ ماضی کی سامراجی دور کی تجارتی کمپنیوں کے کردار کی یاد دلانے والی دیوہیکل ملٹی نیشنل کمپنیاں اس راہ پر گامزن ہیں اور اپنے خطرناک عزائم کی تکمیل کے لیے انھوں نے پوری دنیا کو ایک تجارتی منڈی میں تبدیل کرکے رکھ دیا ہے، جس میں ہر شے محض ایک بکاؤ مال ہے۔ انھوں نے دنیا کے پسماندہ ملکوں کی معیشت کو دیمک کی طرح چاٹ کر انھیں کھوکھلا کردیا ہے۔ انھوں نے اپنی مصنوعات کی فروخت کے لیے فحاشی اور عریانیت کا وہ سیلاب رواں کیا ہے کہ مشرقی اقدار و تصورات کے سانچے ریت کے گھروندوں کی طرح مسمار ہورہے ہیں اور جو باقی ہیں ان کے مستقبل کی کوئی ضمانت نہیں۔ اس عمل میں مختلف ٹی۔وی۔ چینل، مغربی فلمیں، کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور اخبارات و رسائل ان کی بھرپور معاونت کررہے ہیں۔ مغربی تہذیب کی یلغار اور میڈیکل سائنس کی ترقیوں نے انسانی رشتوں کی تعریف پر بھی اثر ڈالا ہے۔ موت پر فتح حاصل کرنے کی انسان کی دبی آرزو نے اسپتالوں کے آپریشن تھیٹر میں انسانی جسم کی مرمت کے نئے ریکارڈ قائم کیے ہیں۔ ٹسٹ ٹیوب بے بی کا چمتکار تو گزرے زمانے کی بات ہوچکی ہے۔ عہدِ حاضر کے صارف سماج میں جہاں ہر شے بکاؤ ہے میڈیکل سائنس نے والدین کو اولاد کا سکھ دینے کے لیے semen بینک کا قیام عمل میں لاکر ان کی مشکل آسان کردی ہے۔ Genetic Engineering کے طفیل جانوروں کے بعد اب انسان کی متوقع کلوننگ نے ہزارہا برس میں قائم ہونے والے تہذیبی معیاروں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ ان ایجادات نے انسانی رشتوں کی تعریف پر بھی سوالیہ نشان قائم کیے ہیں۔

ایک جانب IMF، ورلڈ بینک اور ملٹی نیشنل کمپنیاں دنیا کے پسماندہ ملکوں کی معیشت کو کھوکھلا کررہی ہیں تو دوسری جانب ان ملکوں کی نام نہاد ترقی اور

خوش حالی کے لیے دھمکیوں سے اپنی مرضی کے مطابق پالیسیاں مرتب کرنے پر بھی انھیں مجبور کررہی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ بڑے شہروں میں کاسموپولیٹن کلچر تیزی سے فروغ پاکر اب چھوٹے شہروں اور قصبوں کا رخ کررہا ہے۔ بدلے ہوئے حالات نے ہندستان میں نوجوانوں کی ایک ایسی نسل پیدا کردی ہے جن کا رشتہ اپنی جڑوں سے کٹ چکا ہے۔ ان کے دل و دماغ مغرب کے سحر میں گرفتار ہیں۔ اپنی ذہنی نا آسودگی کی تسکین کے لیے گھنٹوں سائبر اسپیس کی سیر کرتے ہیں۔ نئی نسل اپنا اعتبار اور وقار گنوا کر ذہنی، جسمانی اور مادّی آسودگی کے لیے کسی بھی حد تک جانے کو تیار ہے۔ مغربی تہذیب کے سیلاب کا ہی نتیجہ ہے کہ گھروں کے نقشے تک تبدیل ہوگئے ہیں۔ مشترک خاندان کا تصوّر پاش پاش ہوچکا ہے۔ ایک ہی چھت کے نیچے زندگی بسر کرنے والے افراد کے مابین رشتوں کا تقدس پامال ہورہا ہے۔ روزنامہ اخبار کے صفحات کی زینت بننے والی اس نوعیت کی خبریں ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہیں کہ ہمارے گردوپیش سماج میں کیسی تبدیلیاں رونما ہوچکی ہیں۔

متذکرہ بالا مسائل کے علاوہ عہدِ حاضر میں ملکی سطح پر فرقہ پرستی اور دہشت گردی بھی ایک سنگین مسئلہ ہے۔ فرقہ پرستی نے ملک کی فرقہ دارانہ ہم آہنگی کو تار تار کرکے رکھ دیا ہے۔ آج ملک کی مشترکہ تہذیب، سیکولر روایات اور ادارے اس کی زد پر ہیں۔ چند انتہا پسند تنظیموں کے گھناؤنے عزائم نے لوگوں کو خوف و ہراس کے سائے میں زندگی گزارنے پر مجبور کردیا ہے۔ آج جان و مال اور عزت کچھ بھی محفوظ نہیں۔ ان مسائل کے علاوہ بھی بہت سے مسائل ہیں اور یہ تمام مسائل عہدِ حاضر کے ادیبوں کے سامنے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں جن سے انھیں نبرد آزما ہونا ہے۔

عہدِ حاضر کے حالات نے ادیبوں کو تاریخ ساز کردار ادا کرنے کا موقع دیا ہے۔ تغیر و تبدل زندگی، سماج اور تہذیب کے ارتقا کے ضامن ہیں۔ لیکن عہدِ حاضر میں ادیبوں کو دیارِ مغرب سے آنے والی تبدیلی کی اس لہر کو اپنے سماجی اور تہذیبی معیار پر پرکھ کر اس کے مثبت اور منفی پہلوؤں کی نشاندہی کرنی ہے۔ مغربی تہذیب کی چکاچوندھ کے سحر میں گرفتار نوجوانوں کے سامنے مشرقی تہذیبی وثقافتی قدروں کی اہمیت، معنویت اور افادیت ثابت کرکے نوجوانوں کے دلوں میں ان کے تئیں کھویا ہوا اعتماد بحال کرنا ہے۔ ادیب کے لیے لازمی ہے کہ سماج میں جو ٹوٹ پھوٹ کا عمل جاری ہے اس کے اثرات کا گہرائی سے تجزیہ کرکے اپنے تجربات میں پورے سماج کو شریک کرے۔ ایک سچے ادیب کی ذمّے داری ہے کہ وہ سماج کے سامنے زندگی کا ایک توانا اور صحت بخش تصوّر پیش کرے۔ عہدِ حاضر کے مسائل کے تئیں ادیب کو حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر اپنانا ہے اور معاشرے کی گھٹن اور اضطراب میں نئی امید کا چراغ روشن کرنا ہے۔ عہدِ حاضر کے صارفیت گزیدہ سماج میں ادیب کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ اس کا قلم کس کے ساتھ ہے۔ وہ تہذیبی کے اس سیلاب سے خوفزدہ ہوجائے گا یا پھر اس کی تباہی سے دوسروں کو محفوظ رکھنے کی پرخلوص سعی کرے گا۔ تمام اقدار میں سب سے خوبصورت قدر انسانی آزادی اور زندگی کی خوشحالی کی قدر ہے۔ اسے قدرت کی اس حسین دنیا کو خوب سے خوب تر بنانے کی جستجو کرنی ہے اور اس مشن میں اپنے ساتھ پورے سماج کو شریک کرنا ہے۔ کاروبارِ ادب اگر کارِ پیمبری ہے تو عہدِ حاضر کے ادیب کو اس ذمے داری کا بوجھ اٹھانے سے مفر نہیں۔ اعلا اخلاق و کردار کے زوال کے دور میں ادیب کے اعتقاد و نظریات کی سخت آزمائش ہے۔ ادیب کو حالات کا جائزہ لے کر اپنی راہ کا تعین خود کرنا اور سیاست کا آلۂ کار بننے کے بجائے اس کی رہنمائی کرنی ہے۔ اسے انعام و اعزاز کی سیاست سے بھی اپنا دامن بچانا ہے کیوں کہ انعام و اکرام سیاسی حربے ہیں اور ادیبوں کے لیے دشمنِ ایمان و آگہی اور رہزنِ تمکین و ہوش ہیں۔ یہ ادیب کی ذمے داری ہے کہ اپنی ذات کو سستی شہرت اور اپنی تخلیق کو بازار میں فروخت ہونے والی شے محض ہونے سے محفوظ رکھے۔ ادیب کو ذاتی مفادات سے بلند ہوکر انسانیت کی فلاح کے جذبے سے کام کرنا ہے۔ عہدِ حاضر کے مسائل اتنے سنگین ہیں کہ ادیب کو بھگوان شنکر کا کردار ادا کرنا ہے جنھوں نے سمندر سے نکلنے والا تمام زہر خود پی کر اس کائنات کو تباہ و برباد ہونے سے بچالیا تھا۔ اس امتحان میں کامیاب ہونے پر ہی ادیب کو امرت نصیب ہوگا۔

□□□

Lecturer, Deptt. of Urdu,
Bareli College, Bareli

قومی اردو کونسل نے نہ صرف حوالہ جاتی بلکہ اعلا درجات کی ضرورتوں کے مطابق درسی کتابیں شائع کی ہیں۔

طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت

تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جاتا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
ویسٹ بلاک۔1، آر۔ کے۔ پورم، ونگ-6، نئی دہلی-110066

شاہد حسین

اخباری تحریر کی خصوصیات

صحافی کا رول تاریخ نگار کا سا ہے، جو صرف سچ کی تلاش میں رہتا ہے اور مستقبل کے لیے سچے واقعات چھوڑ جاتا ہے۔ لیکن یہ سچ اسی وقت موثر ہوگا جب اس کی تحریر کا اسلوب معیاری، طرز نگارش دل کش اور زبان و بیان میں کوئی نقص نہ ہو۔ یہ اس لیے اور بھی ضروری ہے کہ آج تحریری صحافت (Print Media) کا مقابلہ برقی صحافت (Electronic Media) سے ہے، جو نہ صرف زیادہ تیز رفتار ہے اور جس کے سامعین کا حلقہ بہت زیادہ ہے بلکہ یہ چوبیس گھنٹے آپ کی دسترس میں ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی درست ہے کہ تحریر میں ایک پائیداری ہوتی ہے جو بولے ہوئے الفاظ کی طرح ہوا میں معدوم نہیں ہوجاتی، اپنے بس میں ہوتی ہے، جب جی چاہے پڑھیے، جتنی بار جی چاہے پڑھیے۔ اسے حوالے کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے، دستاویز کے طور پر محفوظ رکھا جاسکتا ہے اور آنے والی نسلیں اس سے استفادہ کرسکتی ہیں لیکن یہ سب کچھ اسی صورت میں ممکن ہے، جب زبان کی سطح پر بھی اسے دل چسپ اور جاذب بنایا جائے۔

دراصل زبان کا بنیادی عمل کسی اطلاع، مفہوم، خیال، تجربے، واقعات، کیفیات یا صورتِ حال کو قاری یا سامع تک پہنچانا ہوتا ہے۔ اگر کسی تحریر کی زبان ایسی ہو جو اس کے قاری کی سمجھ میں پوری طرح نہ آئے تو وہ تحریر بے مقصد ہوجائے گی۔— اخبار معاشرے کے اس بڑے گروہ کے لیے ہوتا ہے۔ جس میں مختلف تعلیمی سطح کے لوگ ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس کی زبان کو زیادہ سے زیادہ سادہ اور آسان ہونا چاہیے۔ اسی بات کو رحم علی ہاشمی نے خبر کے حوالے سے اس طرح کہا ہے:

"نہ صرف خبروں بلکہ پورے اخبار کی زبان سادہ، بے تکلف اور دل نشیں ہونی چاہیے۔"(1)

ماہرین کا خیال ہے کہ اخباری تحریر کو حشو و زائد سے عاری ہونا چاہیے۔ تحریری صحافت میں Economy of words کا خیال رکھا جاتا ہے۔ لہٰذا مترادفات کا استعمال بھی موزوں نہیں سمجھا جاتا۔ اختصار اور جامعیت اس کے لیے ضروری ہے۔ چنانچہ "وہ دونوں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگئے" کی جگہ "ان کی شادی ہوگئی"؛ "توقع ہے کہ اس معاہدے پر جلد دستخط ہوجائیں گے" کی جگہ "اس معاہدے پر جلد دستخط ہونے کی امید ہے" لکھنا زیادہ بہتر ہے۔

تحریری صحافت میں نامانوس، ادق اور مشکل الفاظ سے ہر صورت میں گریز کرنا چاہیے۔ ایسے سادہ اور آسان الفاظ استعمال کرنا چاہیے جو کم پڑھے لکھے لوگ بھی بہ آسانی سمجھ سکیں۔ ذرائع ابلاغ میں مشکل الفاظ کی نہیں، مناسب الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے۔ روزمرہ زندگی میں استعمال ہونے والے الفاظ اخباری تحریر کا حسن بھی ہیں اور ضرورت بھی۔ اخباری تحریر کے ذریعے قاری کو متاثر کرنا اہم نہیں ہوتا بلکہ معلومات اطلاعات اور تجربات کا ابلاغ اہم ہوتا ہے، اس کے لیے ایسے الفاظ کا استعمال کرنا چاہیے جو عوام میں مقبول ہوں اور جن کی صحت مشتبہ نہ ہو۔ اس سلسلے میں مسکین علی حجازی لکھتے ہیں:

"آسان اور سادہ الفاظ کے استعمال کے ساتھ ساتھ جملوں کی ساخت اور ترکیب بھی آسان ہونی چاہیے، مرکب اضافی یعنی اضافات کا کم سے کم استعمال کرنا چاہیے اور طویل جملوں کے بجائے مختصر جملے بنانے چاہئیں۔"(2)

مرکبات کو توڑ کر سیدھے سادے جملے بنا دینا کوئی مشکل امر بھی نہیں، اخبار ایک عام مطالعے کی چیز ہے، اسے تحقیقی مقالہ نہیں بنانا چاہیے۔ اخباری تحریر میں خیالات و الفاظ کے تکرار کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہوتی، البتہ خبر کا ابتدائیہ اور اس کا متن اس سے مستثنیٰ ہے۔ کیوں کہ خبر کے ابتدائیے میں جو کچھ ہوتا ہے، اس کی تفصیل متن میں ہوتی ہے۔ گو کہ اس میں بھی تکرار سے بچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

صحافتی زبان میں قواعد اور صحتِ املا کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ اس میں جملوں کی ساخت درست اور صرف و نحو کے اصول کے مطابق ہونی چاہیے۔ مبہم الفاظ کے استعمال سے پرہیز کیا جائے اور مروّجہ اصطلاحات ہی استعمال کی جائیں۔ عربی، فارسی اور انگریزی کے نامانوس الفاظ استعمال نہ کیے جائیں۔ غیر معروف نام اور ذو معنی الفاظ کی وضاحت کے لیے اعراب کا سہارا لیا جائے۔ اخبار کو عوام کا معلّم بھی کہا جاتا ہے لیکن یہ موثر معلّم اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب اس کی تحریر زبان کی سطح پر بھی معیاری ہو یعنی روکھی پھیکی نہ ہو۔ مناسب الفاظ، محاورے، مقولے اور شعر کے ٹکڑوں یا مصرعوں کا برجستہ استعمال ہو، جس سے زبان کا تیکھا پن نکھرے۔

عبارت کو چست اور جامع بنانے نیز جملوں کی ساخت میں ہم آہنگی اور تناسب پیدا کرنے کے لیے الفاظ کو کاٹنا چھانٹنا اور ان کی ترتیب کو درست کرنا چاہیے۔ کامیاب صحافی تھوڑی سی توجہ سے پینتیس چھتیس الفاظ کے مطلب کو چودہ پندرہ الفاظ میں ادا کردیتا ہے۔ وہ "مثال کے طور پر" کی جگہ

''مثلاً'' لکھ کر کام چلا لیتا ہے۔ سید اقبال قادری نے ادبی اور اخباری زبان کا موازنہ کرتے ہوئے بڑی اچھی بات کہی ہے:

''ادبی زبان فکر انگیز، خوب صورت، امتیازی اور جاذبِ نظر ہوتی ہے جب کہ اخباری زبان پر لطف، معلوماتی، جامع، سلیس اور عام فہم ہوتی ہے۔''(3)

سادہ زبان، سادہ جملے اور سادہ تحریر سے زبان کی دل چسپی میں کمی نہیں آتی، سادہ الفاظ کی چست بندش و برمحل استعمال اور جملوں کے ہنرمندانہ تناسب سے اسلوب میں شیرینی، روانی اور شگفتگی پیدا کی جاسکتی ہے۔

ادبی تحریر مخصوص قاری کے پیشِ نظر تحریر کی جاتی ہے جو اعلا نہیں تو متوسط ذہنی سطح کا مالک ضرور ہوتا ہے۔ اس کے قاری بھی محدود ہوتے ہیں۔ صحافتی تحریر کے قارئین کا حلقہ بے حد وسیع ہوتا ہے۔ اس میں معمولی سے معمولی ذہن کا قاری بھی شامل ہوجاتا ہے۔

ادبی تحریر فرصت سے لکھی جاسکتی ہے۔ خاص ذہنی کیفیت طاری ہونے پر لکھی جاسکتی ہے۔ اپنے من پسند ماحول میں لکھی جاسکتی ہے۔ اسے دوبارہ، سہ بارہ نظرثانی کرکے نکھارا جاسکتا ہے مگر صحافتی تحریر کے لیے اتنا وقت نہیں ہوتا۔ اس لیے صحافی کو زبان پر پوری قدرت ہونی چاہیے۔ عام ادیب اپنی دل چسپی کے موضوعات کا انتخاب کرسکتا ہے مگر صحافی کو عموماً یہ سہولت بھی حاصل نہیں ہوتی۔ عام ادبی تحریر میں تشبیہ و استعارہ اور رمز و کنایہ کا استعمال کرکے بالواسطہ بات کہنے اور طولِ کلام کے امکانات بھی ہوتے ہیں۔ جب کہ صحافی ایسا نہ کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

حواشی:

1- رحیم علی ہاشمی، فن صحافت، انجمن ترقی اردو ہند، آرمی پریس، دہلی-1943ء (ص-42)

2- مسکین علی حجازی، فن ادارت، اردو سائنس بورڈ، لاہور-1992ء (ص-51)

3- سید اقبال قادری، رہبر اخبار نویسی، ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی-1989ء (ص-270)

□□□

Warden, Sutlej Hostel, JNU, New Delhi-67

جامع انگریزی-اردو لغت (حصہ اوّل تا ششم)

مدیرِ اعلا: کلیم الدین احمد

☆ محققین، مترجمین، دفتری اہل کاروں، اساتذہ، قانون دانوں، اہل علم و قلم، صحافیوں، طلبہ اور عام لوگوں کی روزمرہ ضروریات کے لیے یکساں افادیت کی حامل یہ انگریزی اردو لغت ڈھائی لاکھ سے زائد الفاظ و اصطلاحات و معانی کا احاطہ کرتی ہے۔

☆ یہ لغت دنیا کے کسی بھی موضوع پر انگریزی الفاظ کے اردو مترادفات فراہم کرنے میں آپ کی مدد کرے گی۔

☆ تمام مروّج علوم و فنون سے متعلق انگریزی/اردو الفاظ و اصطلاحات کا ایک جامع ذخیرہ۔

☆ مترادفات، محاورات اور تشریحات سے مزین اپنی نوعیت کی پہلی مستند، وقیع اور ضخیم لغت جو ویبسٹر کو بنیاد بنا کر تیار کی گئی ہے۔

☆ اردو زبان میں نئے سائنسی تصورات اور نئی علمی جہتوں کے اضافے کے ساتھ۔

☆ اکیسویں صدی کے علمی تقاضوں سے ہم آہنگ.....

☆ دوسو سے زائد سائنسی و سماجی علوم و فنون پر محیط.....

☆ امریکی/برطانوی انگریزی کے الفاظ کی صراحت کے ساتھ.....

☆ قومی اردو کونسل کا ایک یادگار کارنامہ.....ایک تاریخی دستاویز، بڑا سائز 11.5x9 انچ۔ عمدہ کاغذ، بہترین طباعت.....

.....کمپیوٹر شدہ کتابت مضبوط و مطلا جلد.....صفحات: حصہ اوّل (1217، قیمت:-/400)، حصہ دوم (1062، قیمت:-/600)، حصہ سوم (1091، قیمت:-/600)، حصہ چہارم (866، قیمت:-/600)، حصہ پنجم (1042، قیمت:-/600)، حصہ ششم (1012، قیمت:-/600)

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

معین الدین خاں

ندی ربط سازی کا منصوبہ

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ—

کرۂ ارض کے 70 فیصد حصے پر پانی رہنے کے باوجود اس ذخیرے کا ایک فیصد حصہ ہی انسانی استعمال کے لائق ہے۔[1]

آج بھی ہندستان کے صرف 40 فیصد زراعتی علاقے کو سینچائی کی سہولت دستیاب ہے بقیہ 60 فیصد علاقے کو بارش کے رحم و کرم پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ ملک کو اکثر ایک جانب خشک سالی تو دوسری جانب سیلاب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔[2]

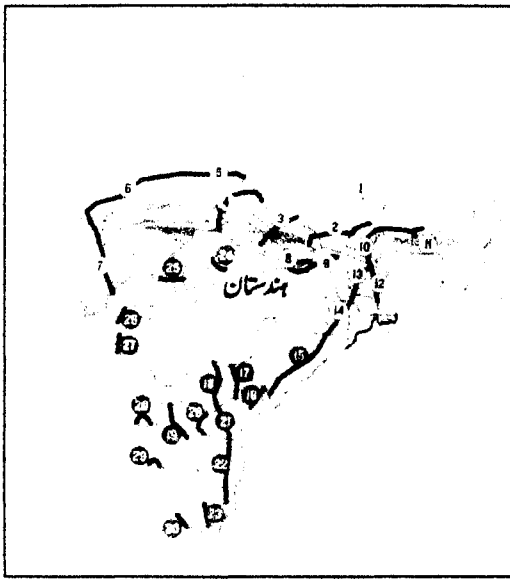

31/اکتوبر 2002 کے سپریم کورٹ کے دور رس فیصلے نے ملک گیر سطح پر ندی ربط سازی کے منصوبے میں گویا جان ڈال دی۔ حکومتِ ہند نے اس منصوبے پر عمل درآمد کے لیے فوراً سابق مرکزی وزیر سریش پربھو کی قیادت میں ایک ٹاسک فورس تشکیل دے ڈالی۔ حکومتِ ہند اس منصوبے کو 31/دسمبر 2016 تک مکمل کر لینے کے لیے پرعزم ہے۔

ندی ربط سازی (ندیوں کو جوڑنے یا ملانے (Interlinking of Rivers) کا منصوبہ اس مفروضے پر قائم ہے کہ فاضل پانی والی ندیوں کو ان ندیوں سے جوڑ دیا جائے جن میں ہر وقت وافر مقدار میں پانی دستیاب نہیں ہوتا۔ اس کے لیے نہر سازی اور بعض علاقوں میں آبی ذخیرے کی تعمیر کا منصوبہ شامل ہے۔ گو کہ ہندستان میں فی کس پانی کی صورت حال ترقی یافتہ ملکوں کے مقابلے میں بہتر ہے[3] لیکن یہاں ہر جگہ اور ہر موسم میں یکساں مقدار میں پانی دستیاب نہیں ہوتا۔ ملک کے 329 ملین ہیکٹیئر رقبے میں سے 40 ملین ہیکٹیئر علاقے کو ہر سال سیلاب سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ جس میں سے 32 ملین ہیکٹیئر علاقے کو سیلاب سے بچایا جا سکتا ہے۔[4]

دوسری جانب ملک میں 142.6 ملین ہیکٹیئر رقبے پر کھیتی کی جاتی ہے، جس میں سے صرف 57 ملین ہیکٹیئر (یعنی 40 فیصد) میں سینچائی کی سہولت دستیاب ہے جب کہ 85.6 ملین ہیکٹیئر (یعنی 60 فیصد) زراعتی علاقے آج بھی مانسون اور دیگر موسمی اور غیر موسمی بارشوں پر انحصار کرتے ہیں۔ گذشتہ چند برسوں میں سینچائی منصوبوں کو خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی ہے، لہٰذا موجودہ حالات کے پیش نظر یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ آئندہ پچیس برسوں میں صرف 20 ملین ہیکٹیئر مزید علاقے میں سینچائی کی سہولت فراہم کی جا سکے گی۔ اس صورت میں بھی 65 ملین ہیکٹیئر زمین کو بارش کے رحم و کرم پر رہنا ہوگا۔[5]

ہندستان میں ندیوں کے پانی کے اہم ذرائع مانسون کی بارش اور پہاڑوں سے پگھلنے والے برف ہیں۔ ماہرین کے مطابق اگر ہر سال مانسون کی بارش سے حاصل ہونے والے تقریباً 544 ملی میٹر پانی میں 25 فیصد کی کمی واقع ہوتی ہے تو ملک کے 80 فیصد حصوں میں خشک سالی ہوتی ہے۔[6] [گذشتہ چند برسوں میں ہونے والی بارش کے لیے نیبل ا دیکھیے] ایک اندازے کے مطابق سال بھر کے 8760 گھنٹوں میں سے تقریباً 100 گھنٹے کی بارش سے (4000BCM) چار ہزار بلین کیوبک میٹر (اس کا 75 فیصد حصہ مانسون کی بارش سے) پانی حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اس بارش سے حاصل پانی میں سے صرف 1900 BCM پانی مختلف ندیوں میں جمع ہو کر ہمارے کام آتا ہے۔[7] جب کہ مانسون کا بیشتر پانی یوں ہی برباد ہو جاتا ہے اور جب مانسون کی بارش بہتر نہ ہو تو ملک کے غذائی پیداوار میں کمی واقع ہوتی ہے۔

اس طرح ملک کو خشک سالی اور سیلاب کا اکثر و بیشتر سامنا رہتا ہے۔

ماہرین ان مسائل کے سدِ باب کے لیے برابر غور وفکر کرتے رہے ہیں، اس سلسلے میں نہر سازی، کنویں کی تعمیر، بارش کے پانی کی ذخیرہ اندوزی کے لیے بڑے حوض کی تعمیر، Rain Harvesting جیسے کئی منصوبوں پر عمل درآمد بھی ہوا۔ لیکن اوّل تو مسئلے کی شدت اور پھر گذشتہ منصوبوں میں خاطر خواہ کامیابی نہ ملنے کے بعد کئی بار انقلابی اقدام کے لیے سوچا گیا۔ ندیوں کو آپس میں جوڑنے کا منصوبہ ایسا ہی ایک بڑا منصوبہ ہے جو دو صدی سے ماہرین کے لیے موضوع بحث رہا ہے۔

سابق مرکزی وزیر سریش پر بھو کی قیادت میں تشکیل کردہ ٹاسک فورس جنوری 2003 سے باضابطہ کام کرنے لگی ہے۔ اس ٹاسک فورس میں ان کے علاوہ نائب صدر سی.بی.پٹیل، ممبر سکریٹری رادھا سنگھ اور واٹر کمشنر ایم.کے.شرما شامل ہیں۔ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے تعلیمی ادارے مثلاً "IITs, IIMS" مالیاتی ادارے مثلاً ID B1, IC ICI اور تجارتی ادارہ مثلاً CII، سرکاری ادارے مثلاً NWDA، نیم سرکاری اور غیر سرکاری اداروں سے بھی امداد لی جارہی ہیں۔

اس منصوبے کے تحت 31 ندی لنک (14 ہمالیائی اور 17 جزیرہ نمایا پٹھاری ندیاں (Penin-Sular River) تعمیر کیے جائیں گے (دیکھیے ٹیبل II)۔ ندیوں کو آپس میں جوڑنے کے عمل کے دوران گیارہ ہزار کیلومیٹر لمبی نہر سازی کا پروگرام ہے اور ساتھ ہی 37 ڈیم بنائے جائیں گے۔ ندیوں کو ملانے کے بعد 173 BCM پانی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاسکے گا۔[9] اس منصوبے پر 5,60,000 (پانچ لاکھ ساٹھ ہزار) کروڑ روپیہ خرچ کیا جائے گا اور اس کو 31 دسمبر 2016 تک مکمل کرلیا جائے گا۔ 14 ہمالیائی ندی لنک پر 3,75000 کروڑ روپے خرچ ہوں گے اور 17 جزیرہ نما/پٹھاری ندی لنک پر 185000 کروڑ روپے کا تخمینہ ہے۔ (لیکن ایک سابق مرکزی سکریٹری برائے آبی وسائل کا کہنا ہے کہ صرف جزیرہ نما ندی لنک پر ہی 500000 کروڑ روپے صرف ہوجائیں گے)۔

ٹیبل I

مانسون کے مہینوں (جون تا ستمبر) میں جولائی میں سب سے زیادہ بارش (یعنی پورے مانسون کا ایک تہائی حصہ) ہوتی ہے۔ پورے ملک کو 36 ضمنی موسمی خطوں (Metrological Sub-division) میں تقسیم کیا گیا ہے۔ 1997 سے 2002 کے درمیان (جون تا ستمبر) ہونے والی بارش کا جائزہ پیش ہے۔ 2002 میں مانسون کی بارش میں زبردست کمی واقع ہوئی۔ کل 36 ضمنی موسمی خطوں میں سے 21 خطوں میں کم بارش ہوئی اور یہ کمی 20 فیصد سے لے کر 59 فیصد تک تھی۔[8]

سال	حسب معمول بارش والے موسمی ضمنی خطے	زائد بارش والے ضمنی موسمی خطے	کم بارش والے ضمنی موسمی خطے	کل موسمی خطے
1997	26	6	3	35
1998	20	13	3	36
1999	25	3	7	35
2000	23	5	7	35
2001	19	1	5	35
2002	14	1	21	36

سب سے پہلے جزیرہ نما ندی لنک تعمیر کیے جائیں گے۔ منصوبے کے پہلے مرحلے میں آٹھ ندی لنک بنائے جانے کی امید ہے۔ اس سلسلے میں ٹاسک فورس نے وزیر اعظم کو اپنی تجاویز اور سفارشات پیش کردی ہیں۔ 80,000 کروڑ روپے کی لاگت سے کیرالا، کرناٹک، تامل ناڈو، آندھرا پردیش، مدھیہ پردیش، چھتیس گڑھ، مہاراشٹر، راجستھان اور اترپردیش کی بعض ندیوں کو ملایا جائے گا۔[10] حکومتِ ہند اس عظیم اور خطیر سرمایہ کاری کا جواز اس بات میں تلاش کرتی ہے کہ اس سے ملک کو سالہا سال سے ہو رہی سیلاب کی تباہیوں اور خشک سالی کے مصائب سے بچایا جاسکے گا۔ گذشتہ سال خشک سالی اور سیلاب کے نتیجے میں 25000 کروڑ روپے کی فصل تباہ ہوگئی۔[11] علاوہ ازیں مرکزی اور ریاستی سرکاروں کو سیکڑوں کروڑ روپے ریلیف کے مد میں خرچ کرنے پڑے اور انسانیت کو جس درد و کرب سے گزرنا پڑا، وہ تو بے حساب ہے ہی۔ سرکاری ذرائع کے مطابق اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے بعد سیلاب اور خشک سالی ماضی کی باتیں رہ جائیں گی۔ زراعت اور تجارت کے ساتھ ملک کے پورے معاشی نظام میں زبردست ترقی ہوگی۔ بقول رادھا سنگھ، ایڈیشنل سکریٹری برائے وزارت آبی وسائل، اوّل، سینچائی والے علاقے میں مزید 35 ملین ہیکٹیر رقبے کا اضافہ ہوگا۔ گذشتہ کئی برسوں سے اس ضمن میں معمولی اضافہ ہوا ہے۔ دوئم، اس منصوبے کے مکمل ہوجانے سے 35000 میگاواٹ پن بجلی کی پیداوار ہوگی اور اس طرح سستے داموں پر 136000 روپے کی بجلی حاصل ہوسکے گی۔[12] سوئم، اس منصوبے کے ذریعے آبی راستوں کو بھی فروغ دیا جاسکے گا۔ یہ بڑی دلچسپ حقیقت ہے کہ ہندستان میں سڑکوں اور ریلوے کی تعمیر اور پھیلاؤ پر برابر زور دیا جاتا رہا ہے، حتیٰ کہ ہوائی رابطوں کو بھی مستحکم کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن کبھی بھی آبی آمد ورفت پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ اس سے چوتھا فائدہ یہ ہوگا کہ منصوبے سے متاثر افراد کو بھی بہتر معیارِ زندگی نصیب ہوسکے گا۔ ان دنوں چین میں Three

Gorges Dam منصوبہ پر کام ہو رہا ہے۔ یہ نہ صرف زراعت کے لیے مناسب ہے بلکہ اس سے شہریوں کے معیارِ زندگی میں بھی بہتری آرہی ہے۔ ڈیم سے متاثر لوگوں کو گھر بنا کر دیے جارہے ہیں اور روزگار کے مواقع بھی پیدا ہو رہے ہیں۔

ایک اندازے کے مطابق ندی ربط سازی منصوبہ پر کام کے دوران کم از کم دس لاکھ افراد کو آئندہ دس برسوں تک روزگار کے مواقع حاصل ہوں گے۔ یہ اس منصوبے کا پانچواں مثبت پہلو ہے۔ مزید برآں اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں جدید ٹکنالوجی کی ضرورت پڑے گی جس کی وجہ سے غیر ملکی زرمبادلہ کی بچت ہوگی۔ ان سب مثبت پہلوؤں کے ساتھ اس منصوبے کے ذریعے گاؤں سے شہروں کی جانب نقل مکانی کو روکنے میں مدد ملے گی اور دیہی زندگی کو بھی فروغ حاصل ہو سکے گا۔ اور ان سب کا مجموعی اثر یہ ہوگا کہ ملک خوش حال اور اس کے شہری قومی ہم آہنگی سے سرفراز ہوں گے۔

بے شک ندی ربط سازی کا تصوّر نیا نہیں ہے اور اس سلسلے میں غور و فکر کا سلسلہ 1839 سے جاری ہے۔ لیکن پھر بھی اس منصوبے پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ 1972 میں جو مطالعے شروع کیے گئے، اس کے اہم حصوں کو قومی مصلحتوں کے پیش نظر صیغۂ راز میں ہی رکھا گیا، مئی 2002 میں مرکزی وزیر برائے آبی وسائل نے جب چند ندیوں کو جوڑنے کا اعلان کیا تو اس پر کسی نے دھیان نہیں دیا۔ لیکن 2002 کی خشک سالی اور چند افراد کی انفرادی کوششوں سے اس منصوبے کو تقویت ملی اور سپریم کورٹ کے فیصلے نے تو گویا انقلاب ہی لا دیا۔ حکومتِ ہند سپریم کورٹ کے فیصلے کو نافذ کرنے کے لیے بڑی تیزی سے کام کرنے لگی۔ اس منصوبے سے انسانی آبادی اور ماحولیات پر کیا اثرات مرتب ہوں گے، آیا کتنے لوگ نقل مکانی کے لیے مجبور ہوں گے۔ ان کو کتنا معاوضہ ملے گا، ان کی بازآبادکاری کیسے کی جائے گی، ان سبھی سوالوں پر فی الحال خاموشی ہے۔ گرچہ سریش پربھو کا کہنا ہے کہ ”اگر کسی بھی ندی لنک سے فائدے کے بجائے نقصان ہوا تو اس منصوبہ کو ترک کردیا جائے گا۔“[13] لیکن یہ فیصلہ کرنے تک غالباً کافی دیر ہو چکی ہوگی۔ ناقدین کا یہ بھی کہنا ہے کہ 1972 میں وزارتِ آبی وسائل کے مطالعے کافی پرانے ہو چکے ہیں۔ آبی ماہرین اس کے متعلق بھی جانکاری چاہتے ہیں کہ کتنی مقدار میں پانی کو ایک ندی سے دوسری ندی میں منتقل کیا جائے گا۔ کس طرح ریاستوں کے درمیان پانی کی مساوی تقسیم ہوگی۔

یہاں یہ بات بھی ذہن نشیں رہنی چاہیے کہ ندی ربط سازی منصوبہ عام منصوبوں سے مختلف ہے۔ بلکہ اس سے ملک کے جغرافیائی حالات میں تبدیلی ہو سکی ہے۔ اس بات سے کسی کو اختلاف نہیں ہے کہ ملک میں ترقی اور خوشحالی کا دور دورہ ہونا چاہیے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ خوشحالی کے حصول کے لیے طریقۂ کار کیا ہوں اور یہ سوال بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے کہ خوشحالی کا نشانہ کیسے افراد ہیں۔ اس کے علاوہ اس منصوبے سے پیدا ہونے والے دیگر مسائل کا تجزیہ بھی لازمی ہے۔

ندی ربط سازی کا موجودہ منصوبہ ملک کا سب سے بڑا منصوبہ ہے۔ اس پر 560000 کرور روپے صرف ہوں گے اگر یہ منصوبہ وقت پر مکمل نہ ہو سکا تو اخراجات کے مد میں مزید اضافہ ہوگا اور ہمارے یہاں بڑے منصوبے وقت پر مکمل ہوں، ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ ملک کے زیادہ تر آبی منصوبے اپنے اصل تخمینہ سے 50 فیصد سے 893 فیصد زائد لاگت پر مکمل ہوتے ہیں۔ خود سریش پربھو کا اندازہ ہے کہ موجودہ منصوبہ، جو 112 بلین ڈالر کا ہے، وہ 200 بلین ڈالر بھی ہو سکتا ہے۔ مزید یہ کہ اگر بیرونی سرمایہ کاری (جس کے امکانات ہیں) کی ضرورت پڑی تو روپے کی قیمت گرنے سے اخراجات میں اضافہ ہی ہوگا۔ اور بعد میں ہمیں غیر ملکی زرمبادلہ میں قرض کی ادائیگی کرنی ہوگی۔ اور اگر بیرونی مالیاتی اداروں سے پورے منصوبے کے لیے سرمایہ بقول انجینئرِ عالم حاصل کیا جائے تو ہر سال 20000 کروڑ تا 30000 کروڑ روپے بطور سود ادا کرنے ہوں گے۔[14] یہاں یہ بات بھی ذہن نشیں رہے کہ اس وقت مرکزی اور ریاستی سرکاروں کی مالیاتی حالت اچھی

ٹیبل II

اہم ہمالیائی ندی لنک کے نام

کوسی میچی (Mechi)، کوسی۔گھاگھرا، گنڈک۔ گنگا، گھاگھرا۔ جمنا، ساردا۔ جمنا، جمنا۔راجستھان، راجستھان۔سابرمتی، چنار۔سون بیرج، سون باندھ۔گنگا کی جنوبی معاون ندیاں، برہم پتر۔گنگا (MSTG)، برہم پتر۔گنگا (ALT)JTF)، فرکا۔سندربن، گنگا دامودر۔سورن ریکھا، سورن ریکھا۔مہاندی۔

اہم جزیرہ نما ندی لنک کے نام

1- مہاندی (منی بھدرا)۔گوداوری (دولائی سورم) 2- گوداوری (انچم پلی)۔ کرشنا (ناگرجن ساگر) 3- گوداوری (انچم پلی ڈیم)۔کرشنا (ناگرجی ساگر) 4- گوداوری (پولاورم)۔ کرشنا (وجے واڑہ) 5- کرشنا (الماٹی) پینار 6- کرشنا (سری سیلم)۔ پینار 7- کرشنا (ناگرجن ساگر)۔ پینار (سوماسلا) 8- پینار (سوماسیلا)۔کاویری (گرانڈ انیکٹ) 9- کاویری (کٹالائی)۔ ویگائی۔گنڈا 10- کین۔بٹوا 11- پربتی— کالی سندھ۔چمبل 12- پار — تاپتی۔ نربدا 13- دمن گنگا۔پنجل 14- بیڈتی۔وردا 15- نیترا وتی۔ہیماوتی 16- پمبا۔اچن کوول۔ ویپر۔

نہیں ہے۔ فنڈ کی کمی کے باعث سینچائی کے سیکڑوں منصوبے التوا میں پڑے ہیں۔ دسویں پنج سالہ منصوبے (2002-2007) کے آغاز کے وقت سینچائی کے 159 بڑے منصوبے، 242 درمیانی منصوبے اور دیگر 89 منصوبے نامکمل تھے۔ ان پر بالترتیب 58344 کروڑ روپے، 4465 کروڑ روپے اور 8265 کروڑ روپے یعنی کل 71062 کروڑ روپے درکار ہیں۔[15] لہٰذا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب حکومت کے پاس پہلے سے جاری منصوبے کو مکمل کرنے کے لیے فنڈ کی کمی ہے تو اس عظیم منصوبے کے لیے 560000 کروڑ روپے کیسے اکٹھے کیے جاسکیں گے اور نامکمل منصوبوں کو یوں ہی چھوڑ دیا جائے تو اس سرمایے کا کیا بنے گا جو پہلے ہی منصوبے میں لگایا جاچکا ہے؟ پلاننگ کمیشن کا کہنا ہے کہ اگر سینچائی کے موجودہ منصوبوں میں صرف دس فیصد کا اضافہ کردیا جائے تو مزید 14 ملین ہیکٹیئر رقبے میں سینچائی کی سہولت دستیاب کرائی جاسکتی ہے۔[16] گذشتہ دہے میں سینچائی پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ 1966 میں آمدنی کا 22 فیصد سینچائی پر خرچ کیا جارہا تھا جو 1990 میں صرف 6 فیصد ہوکر رہ گیا۔ دوسری اہم بات یہ بھی ہے کہ دسویں پنج سالہ منصوبے میں اس منصوبے کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔

مالیاتی سوالوں کے ساتھ ساتھ ایک اہم تشویش ماحولیات کے حوالے سے بھی ہے۔ حکومت ہند نے ماحولیات کے تحفظ کے لیے National Biodiversity Strategy and Action Plan قائم کیا ہے۔ کیا اس کی سفارشات اس منصوبے کے حق میں ہوں گی؟ اگر ایسا ہوا بھی تو کیا اس حقیقت کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے کہ ''ہر ندی سے ایک پیچیدہ ماحولیاتی نظام وابستہ ہوتا ہے جو متعدد آبی زندگیوں سمیت دیگر حیاتیاتی عناصر کے لیے پناہ گاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔''[17] پھر دوسری جانب گنگا سمیت دوسری ندیوں میں آلودگی بڑھ رہی ہے۔ کل کارخانوں کے فضلات آبی ماحول کو پراگندہ کررہے ہیں۔ کروڑوں روپے خرچ کرنے کے بعد بھی ندیوں میں آلودگی برقرار ہے۔ دلی سرکار تو صرف جمنا ندی کی صفائی پر گذشتہ چند برسوں میں آٹھ سو کروڑ روپے خرچ کرچکی ہے اور اس کے نتائج خاطر خواہ نہیں رہے ہیں۔ ندیوں کو ملانے سے ایک ندی کی آلودگی دوسری ندی میں منتقل ہوگی جس سے مکمل آبی نظام کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔

خشک سالی سے نبٹنے کے لیے آبی وسائل کو دوسرے طریقوں سے بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں Rain Harvesting اور Water Conservation کو بروئے کار لایا جاسکتا ہے 2002 کی آبی پالیسی میں ان اسکیموں کا صراحت سے ذکر ہے۔ آخر ان پالیسیوں کو کیوں نظر انداز کیا جارہا ہے؟

آبی ماہرین خشک سالی کے مسئلے اور فصل کی پیداوار کو اب ایک نئے زاویے سے دیکھ رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ پانی کی قلت کے مسئلے کو اب تک رسد کے ذریعے (Supply Side) حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ طریقہ کار مناسب نہیں ہے۔ سبز انقلاب کے سبب بلاشبہ فصلوں کی پیداوار میں اضافہ ہوا لیکن اس طریقہ کار نے پانی کی کھپت کو بے تحاشہ بڑھا دیا ہے۔ اس سلسلے میں International Water Management Institute کے ڈائرکٹر جنرل فرینک آر رجس برمن (Fran K. R. Rijsberman) کا کہنا ہے کہ اب تک فی ہیکٹیئر فصل کی پیداوار پر زور دیا جاتا رہا ہے لیکن اب اس معیار کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ اب معیار یہ ہونا چاہیے کہ کتنے پانی کے استعمال سے کتنی فصل پیدا کی جاتی ہے۔ کیوں کہ پانی کا مسئلہ گمبھیر بنتا جارہا ہے۔ عالمی بینک کے 1998 کے ایک اندازے کے مطابق پانی کی عالمی تجارت انیسویں صدی کے پہلے عشرے میں ہر سال تقریباً 800 بلین ڈالر کی ہوگی۔[18]

مذکورہ بالا نکات کو دیکھتے ہوئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ جو لوگ اس منصوبے کی مخالفت کررہے ہیں ان کی ساری دلیلیں اور جواز بے بنیاد ہیں۔ دراصل ایسے منصوبے سیکڑوں سال میں ایک بار انجام پاتے ہیں اور اس منصوبے کے اخراجات ایک مخصوص علاقے کے بجائے پورے ملک پر پڑیں گے۔ لہٰذا ہم جو کچھ بھی کریں اسے نہ صرف حال کے لیے ہونا چاہیے بلکہ بہتر مستقبل کی نوید بھی ہونا چاہیے۔

حواشی:

(1) دی ہندو، 6/جون 2003
(2) اکنامک سروے 2002-2003 ص 165
(3) ہندستان میں فی کس 1947 مربع میٹر (کیوبک میٹر) پانی دستیاب ہے جبکہ بلجیم میں یہ مقدار 1228 نیوزی لینڈ میں 532 اور اسرائیل میں تو محض 184 کیوبک میٹر ہے۔ سنڈے ٹائمز آف انڈیا، 21 مئی 2000
(4) انڈیا 2003، حکومت ہند۔ ص 439، واضح رہے کہ صرف بہار میں گذشتہ سال سیلاب کی زد میں آنے سے 419 افراد کی موت واقع ہوگئی اور 1.57 کروڑ افراد اس سے متاثر ہوئے۔ ٹائمز آف انڈیا 9 ستمبر 2002
(5) اکنامک سروے 2002-2003، ص۔ 165
(6) ''دی ہندو'' 22/اکتوبر 2002
(7) ''دی ہندو'' 2/دسمبر 2002
(8) اکنامک سروے 2002-2003، ص-155
(9) دی سروے آف دی انورنمینٹ، 2003 چینئی، ص۔ 43
(10) ''دی ہندو'' 28/مارچ 2003
(11) ''دی ہندو'' 22/اکتوبر 2002
(12) ''دی انڈین ایکسپریس'' 2/مارچ 2003
(13) ''دی ہندو'' 6/مارچ 2003
(14) ''دی ہندو'' 2/فروری 2003
(15) ''انڈیا'' 2003 ص۔ 439
(16) دی ہندو سروے آف دی انوارمینٹ 2003
(17) ایضاً ص۔ 30
(18) ''دی ہندو'' 2/فروری 2003

☐☐☐

250. Jhelam Hostel, J N U, New Delhi-67

تحریر: وی ایم موہن راج
ترجمہ: محمد رستم علی

کتابوں کی دنیا سے بچوں کی شناسائی

ٹیلی ویژن اور کمپیوٹر بچوں کی پڑھائی پر گہرا اثر ڈالتے ہیں اور پڑھائی سے متعلق ان کا معمول خراب کرتے ہیں۔ بچوں کے اندر پڑھائی کی عادت ڈالنے کے لیے بچپن ہی سے ان کے سامنے کتابیں پیش کی جانی چاہیے اور پڑھائی سے متعلق دوسری چیزیں ان کو دکھائی جانی چاہیے۔ بہت سارے گھروں میں کتاب کی مقدس جگہ پر ٹیلی ویژن نے قبضہ جما لیا ہے۔ ایسے گھر بہت کم ہوں گے جہاں بچے اپنے بزرگوں کو پڑھتے ہوئے دیکھتے ہیں یا جہاں بزرگ حضرات کہانیاں پڑھ کر اپنے بچوں کو سناتے ہیں۔ ایسے کتب خانے بھی کم ہی ہیں جو بچوں کو کتابیں ہاتھ میں لے کر دیکھنے کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ اسی طرح ایسے کتب خانوں کی تعداد بھی بہت کم ہی ہے جہاں بزرگ لوگ کہانیاں پڑھتے ہوں یا پڑھی جانے والی کہانیوں کو سنتے ہوں۔

بسا اوقات کتب خانوں میں بچوں کو دیکھ کر لائبریرین ناک بھوں سکوڑتے ہیں اور انھیں کتب خانے سے دور رکھتے ہیں۔ حالانکہ کتب خانے میں بچوں کا شعبہ (Children Section) موجود ہوتا ہے۔ یہ لوگ سوچتے ہیں کہ بچے کتب خانوں کی خدمات کے مستحق ہی نہیں ہیں۔ ان کی سوچ شاید اس مفروضے پر مبنی ہے کہ کتب خانے صرف بڑی عمر کے لوگوں کے لیے ہوتے ہیں۔ درحقیقت اس طرح کا رجحان بہت بودا اور مضحکہ ہے۔ پرانے زمانے کے زیادہ تر کتب خانے چھپے ہوئے کاغذات کے گودام ہوتے تھے جبکہ آج کے دور میں کتب خانوں کو کتابوں اور رسالوں کے ساتھ ساتھ پروجیکٹرس (projectors) آڈیو۔ ویزول کیسیٹس، CD/DVD پلیرس (players) ٹیلی ویژن اور کمپیوٹر سے آراستہ ہونا چاہیے جو کہ ناخواندہ بچوں تک پہنچ کے لیے خاص ذرائع ثابت ہو سکتے ہیں۔

مزید برآں آج عوامی کتب خانوں کو کم عمر اسکولی بچوں کی سہولت کے لیے کھلونوں اور کھیل کود کے دوسرے سامان کا انتظام کرنا چاہیے۔ یہ صرف بالغوں کے کتب خانوں کی بات نہیں ہے بلکہ عوامی کتب خانے بھی جو سماجی طور پر پسماندہ بچوں کی خدمت کے خاص ادارے ہیں، کھیل کود کا سامان مہیا کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کرتے۔ بہت سارے لائبریرین یہ کہہ سکتے ہیں کہ کھیل کود کے سامان کو پڑھائی کے آلات کے طور پر استعمال کرنے پر عام طور پر ایک سوالیہ نشان لگا ہوا ہے اور پھر کتب خانہ کوئی کھیل کا میدان یا نرسری اسکول تو ہے نہیں جو کھیل کود کے سامان کا انتظام کرے۔

لیکن یہ بات تو ضرور تسلیم کرنی پڑے گی کہ کھیل کود کے بہت سارے سامان ایسے بھی ہیں جو تعلیمی اعتبار سے بہت اہم ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کتب خانے نرسری نہیں لیکن بچوں کے دلوں میں کتابوں سے انسیت پیدا کرنے کے لیے انھیں مجازاً نرسری تصور کیا جا سکتا ہے۔ بے شک کھیل کود کے سامان نہ صرف اس وقت بے وقعت ہو جاتے ہیں جب ان کا استعمال بچوں کو بہلا پھسلا کر کتب خانے کے ممبروں کی تعداد بڑھانے کے لیے استعمال کیا جائے۔ یہ اس صورت میں بھی مستحسن نہیں، اگر بچوں کے والدین کو لبھانے کے لیے ان کا استعمال کیا جائے۔ لیکن کتب خانوں کے لیے یہ مناسب ہے کہ وہ اس شعبے سے جڑے ہوئے دیگر اداروں کے ساتھ مل کر کام کریں۔ مثال کے طور پر نرسری، بال واڑی اور کنڈر گارٹین یہاں تک کہ ان نرسری اسکولوں کے ساتھ بھی مل کر کام کیا جا سکتا ہے جو بچوں کے ذہنی فروغ میں لگے ہوئے ہیں۔

اسکول میں کم عمر بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے والدین کے ساتھ مل جل کر کام کرنا ضروری ہے۔ ایک Czech ماہر تعلیمات کہتا ہے ''والدین بچوں کے اوّلین معلّم ہوتے ہیں اور بچوں کو ان کی معاونت کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔'' لیکن ہمارے سماج میں ایسے ماحول کا فقدان ہے جو والدین کو ان کی ذمے داری کا احساس دلا سکے۔ زیادہ تر والدین پڑھے لکھے ہی نہیں ہوتے یا پھر ان کی پہلی یا دوسری نسل ہی تعلیم سے آشنا نظر آتی ہے۔ یہ تو سچ ہے کہ لائبریرین کبھی والدین کی جگہ نہیں لے سکتے جن کی گود اولاد کی پہلی تربیت گاہ ہے، انھیں بچوں کو کتب خانے کی راہ دکھانے کے لیے بہر حال والدین کا تعاون درکار ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا کھیل کود کے سامان لائبریرین کو والدین، پری پرائمری اداروں اور پرائمری اسکولوں سے متعارف کرانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ بہت سے والدین، نرسریوں کے نگراں، اساتذہ اور کبھی کبھی تو خود لائبریرین بھی کھیل کود کے ایسے مختلف الانواع جدید سامان سے آگاہ نہیں ہوتے جو ابھی بازار میں چھائے ہوئے ہیں۔ یہ سامان حاصل کر لینے کے بعد لائبریرین والدین، کریچ (Creche۔ بچوں کی تربیت گاہ) کے نگراں اور

ابتدائی اسکولوں کے اساتذہ کے ساتھ میٹنگ رکھ سکتے ہیں اور انھیں ان سامانوں سے متعارف کروا سکتے ہیں۔ کتب خانوں کی خدمات کے ذریعے مختلف طریقوں سے لائبریرین اور والدین، نگراں و اساتذہ کے درمیان قربت میں اضافہ ہوگا۔ اس طرح یہ والدین کے لیے بھی قابلِ مسرت ہوگا اگر بچوں کو لانے پر کتب خانے میں ان کا استقبال کیا جائے۔ اس طرح آہستہ آہستہ بچے خود بخود کتب خانے میں آنا جانا شروع کردیں گے۔

تفریحی سامان کے ساتھ ساتھ کتب خانوں کو دلکش انداز میں گفتگو کرنے والوں اور تصویر والی کتابوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے جنھیں دیکھ کر وہ بچے بھی لطف اندوز ہوسکیں گے جو حروف تہجی سے واقف نہیں ہیں۔ جو بچے صرف کھیلنے کے لیے کتب خانے آتے ہیں، انھیں کتابیں دیکھنے پر اکسانا چاہیے۔ ایک مرتبہ جب لائبریرین کتابوں کے ساتھ بچوں کا رشتہ جوڑنے میں کامیاب ہوجائیں تو بچوں کو ان کے ذوق کے لحاظ سے کہانیاں سنانے کا انتظام کرنا چاہیے۔ لائبریرین کو چاہیے کہ وہ کتابیں پڑھ کر کہانیاں سنائیں تاکہ بچے کتابوں کو دلچسپی کا ایک ذریعہ تصور کرنے لگیں۔ اس طرح یہ تاثر ان کے دماغ میں تا دیر قایم رہے گا اور ایک بار جب وہ پڑھنا سیکھ لیں گے تو خود بخود کتابوں سے محظوظ ہونے لگیں گے۔ کتب خانوں میں کم از کم ہفتے میں آدھا گھنٹہ بچوں کو کہانی سنانا چاہیے۔ کہانی کو منتخب کرنے میں بچوں کی عمر کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ کوئی بھی کہانی زیادہ طویل نہ ہو کہ سنتے سنتے بچے اکتا جائیں۔

وقتاً فوقتاً بچوں کو ان کی عمر کی فلمیں بھی دکھانا چاہیے جس کے لیے والدین کو بطور خاص مدعو کرنا چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ ایسے کتب خانے جن میں فلم دکھانے کا ضروری سامان موجود ہو، ہمارے ملک میں زیادہ نہیں ہیں۔ البتہ قصبوں اور شہروں میں ایسی دکانیں ضرور موجود ہیں جہاں فلم دکھانے کا ضروری سامان مناسب کرایے پر دستیاب ہو جاتا ہے۔ عام طور پر یہ چیزیں عوامی کتب خانوں پر ہی منحصر ہوتی ہیں کیونکہ دوسری قسم کے کتب خانوں کے اختیارات ان چند خاص لوگوں تک محدود ہوتے ہیں جو ان کا استعمال کرتے ہیں، اس لیے ایسے کتب خانے بچوں کے لیے کچھ کرنے اور ان کے اندر کتابیں پڑھ کر محظوظ ہونے کی عادت نہیں پیدا کرسکتے۔ "بچے پڑھنا نہیں جانتے" یہ کہہ کر بچوں کو کتب خانوں کی خدمات سے محروم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ آج کے دور میں عوامی کتب خانے ایسے آڈیو۔ویژول پروگرام چلا سکتے ہیں جو ایسے بچوں کے لیے بھی معاون ثابت ہوسکتے ہیں جنھوں نے ابھی تک خواندگی کی دنیا میں قدم نہیں رکھا۔

(بشکریہ "دی ہندو" 19/اگست-2003)

□□□

042 Sabarmati Hostel, J.N.U. , New Delhi 110067

اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ
پروفیسر محمد حسن
ادبی سماجیات ایک نئے علم کی حیثیت سے حال ہی میں سامنے آئی ہے۔ یہ کتاب اردو میں ادبی سماجیات کے مطالعے کی پہلی کوشش ہے جو اس کے تمام اہم پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔
پہلی اشاعت
334 صفحات، قیمت: 98.00 روپے

اردو ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ترسیل و ابلاغ کی زبان
ڈاکٹر کمال احمد صدیقی
مصنف برسوں تک آل انڈیا ریڈیو میں ذمے دارانہ عہدوں پر رہے ہیں، انھوں نے باریک بینی کے ساتھ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی زبان پر گفتگو کی ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے قلم کاروں کے لیے یہ کتاب خصوصی افادیت رکھتی ہے۔
پہلی اشاعت
646 صفحات، قیمت: 200.00 روپے

اردو ڈراموں کا انتخاب
مرتب: پروفیسر محمد حسن
1947ء سے 1990 تک اردو میں لکھے جانے والے ڈراموں کا ایک نمائندہ انتخاب جن میں تاریخی، نیم تاریخی، سماجی اور سراسر تخیلی ڈرامے بھی شامل ہیں۔ ابتدا میں فاضل مرتب نے ڈرامے کے فن اور اس کی روایت پر بھرپور گفتگو کی ہے۔
پہلی اشاعت
600 صفحات، قیمت: 156.00 روپے

مولانا ابوالکلام آزاد: ایک ہمہ گیر شخصیت
رشیدالدین خاں
اس کتاب میں مولانا آزاد کی زندگی کے سوانحی گوشوں پر بہ طور خاص روشنی ڈالی گئی ہے۔
صفحات: 684، قیمت: 58.00 روپے

مولانا ابوالکلام آزاد: شخصیت، سیاست، پیغام
رشیدالدین خاں
مولانا آزاد کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کے علمی اور عملی کارناموں کا مکمل تعارف ـــ
(دوسرا ایڈیشن)، صفحات: 336، قیمت: 76.00 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

تحریر: ہریش اگروال
ترجمہ: فیاض عالم

حقیقی آزادی اور عام سائنس

گذشتہ دہائی میں عالمی سطح پر غیر معمولی معاشی ترقی کے باوجود ایک ڈالر سے بھی کم پر گزر بسر کرنے والے افراد کی تعداد میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ وہ قدرتی چیزیں جن پر غریبوں کی زندگی کا انحصار ہے (مثلاً لکڑی، مچھلی، جڑی بوٹی وغیرہ) وہ ختم ہوتی چلی جارہی ہیں۔ ریو (Rio) میں منعقدہ Earth Conference اور دیگر بین الاقوامی مذاکروں میں دنیا کے لیڈروں نے ماحولیات کی حفاظت کے وعدے کیے تھے۔ لیکن آج بھی صورت حال میں بہتری نہیں آسکی ہے اور اس قدرتی نعمت کو اسی طرح برباد کیا جارہا ہے۔ آلودگی پھیل رہی ہے، آب وہوا میں تبدیلی کی وجہ سے بیماریاں بڑھتی جارہی ہیں۔ کرپشن میں اضافہ ہوتا جارہا ہے اور دہشت گردی کا خطرہ ہر پل منڈلاتا نظر آتا ہے۔ صحت کی حالت بھی نازک ہے۔ ایک چوتھائی بیماریاں گندے پانی اور ہوا کی وجہ سے ہوتی ہیں۔

کھیتی کے لیے زمین کم پڑتی جارہی ہے۔ جدید تحقیقات سے پیداوار میں کافی اضافہ ہوسکتا ہے لیکن یہ ترکیب اپنائی نہیں جارہی ہیں۔ حال ہی میں نوبل انعام یافتہ ماہر معاشیات پروفیسر امرتیہ سین نے کہا تھا کہ ترقی کا مطلب سماجی، معاشی اور تہذیبی آزادی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ بھوک اور بیماری سے بھی نجات ضروری ہے۔ انھوں نے مثال کے ذریعے یہ واضح بھی کیا کہ ہندستان کے معاشی نظام کی ایک بڑی ناکامی یہ بھی ہے کہ اناج کی بھرپور موجودگی کے باوجود ملک میں وسیع پیمانے پر فاقہ کشی کی حالت بنی ہوئی ہے۔ ہندستان میں ناقص تغذیہ کا اوسط 40 سے 60 فی صد ہے جب کہ افریقہ میں یہ 20 سے 40 فی صد ہے۔ پروفیسر امرتیہ سین ترقی کو ایک الگ نظریے سے دیکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ترقیاتی شرح اور جی۔ڈی۔پی۔ ہی ترقی کے غماز نہیں ہیں۔ انسانی ترقی بے حد اہم ہے۔ یہ ترقی بہت سارے مواقع فراہم کرتی ہے۔ یہ انسان کو وہ زندگی دیتی ہے جو وہ چاہتا ہے۔ اب اقوام متحدہ کے انسانی ترقیاتی رپورٹ میں بھی تعلیم اور صحت پر خاص توجہ دی جارہی ہے۔

ترقی سے مراد صرف دولت اکٹھا کرنا نہیں ہے— یہ انسانی آزادی کی توسیع کا عمل ہے جس میں صارفیت مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ کچھ اور چیزیں بھی ضروری ہیں۔ آزادی کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ ایک طرف اگر بھوک، غیر ضروری بیماری اور فاقہ کشی سے آزادی ملنی چاہیے تو دوسری طرف سیاسی اور شہری حقوق، سماجی حصے داری کے مواقع اور ثقافتی تخلیقیت کی آزادی بھی ملنی چاہیے۔ بہتر بنیادی تعلیم اور صحی خدمات سے لوگوں کی آزادی میں اضافہ ہوتا ہے۔ جو تعلیم یافتہ اور صحت مند ہوگا، وہی معاشی ترقی کا فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اگر کوئی جاہل ہے تو وہ اچھی نوکری سے محروم رہ جائے گا۔

موجودہ عالمی اور مقامی پینٹنٹ قانون دنیا کے غریب اور ضرورت مند لوگوں کے حق میں نہیں ہیں۔ کیوں کہ اس کی وجہ سے دوائیں مہنگی ہوجاتی ہیں اور غریب افراد موذی امراض سے بچانے والی یہ دوائیں خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ ایڈس جیسی بیماری کا مقابلہ اسی لیے مشکل ہوتا جارہا ہے۔ ان دواؤں پر بہت زیادہ رائلٹی لی جاتی ہے، اس لیے یہ مہنگی ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ رائلٹی کو حق بجانب بھی تصور کیا جاتا ہے۔

سائنسی نظام اجارہ پسند نہیں ہے، آخر علم پر سب کا حق ہے۔ وہ کسی مالک کے فائدے کے لیے نہیں ہے۔ بقول امرتیہ سین یہ خوشی کی بات ہے کہ حساب، علم کیمیا، اور طبیعات کے فارمولے کا کسی نے پینٹنٹ نہیں لیا۔ کیا ہوتا اگر کسی نے اعشاریہ نظام کے دنیا میں پھیلنے سے قبل پینٹنٹ لے لیا ہوتا۔ کسی کے نجی مفاد کے لیے دنیا ترقی سے محروم رہ جاتی۔ یہ ضروری ہے کہ سائنس کو عالمی روایت تسلیم کیا جائے۔ عام طور سے عالمگیریت کو مغربیت سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن اس حقیقت کو تسلیم کرنا چاہیے کہ جسے ہم آج مغربی سائنس کہتے ہیں، وہ دنیا کی وراثت پر قائم ہے۔ یہ سائنسی نظریوں کے لین دین پر مبنی ہے۔ چینی سائنس اور ٹیکنالوجی، ہندستان اور عرب کی ریاضی اور اس طرح کی دیگر مغربی روایات نے یورپ کی ترقی میں نمایاں رول ادا کیا۔

یہ بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ عالمگیریت غیر معمولی سائنس اور تکنیکی ترقی کی دین ہے۔ مائکروچپس، جیٹ ایئر سیارے اور آپٹیکل فائبر ان اہم ایجادات میں شامل ہیں، جنھوں نے تیزی سے ترقی کی راہ پر گامزن دنیا کے ہر ایک حصے کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے۔ لیکن سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ کیا سائنس اور تکنیکی طاقت پوری دنیا کو اور امیر اور پرامن بنا پائے گی؟ یا امیر اور امیر اور غریب اور غریب ہوتے جائیں گے؟

آج حالت یہ ہے کہ دنیا کے 20 فیصد سب سے امیر ملک دنیا کے 86 فیصد سرمایے کا استعمال کرتے ہیں۔ دنیا حقیقت میں ترقی کررہی ہے، لوگ زیادہ دنوں تک زندہ رہ رہے ہیں۔ انھیں تعلیم حاصل کرنے کے زیادہ

مواقع مل رہے ہیں۔ 1970 کے بعد بچوں کی شرحِ اموات 10% سے گھٹ کر 5% ہوگئی ہے۔ باوجود اس کے عدمِ مساوات اور عدمِ استحکام میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ بہت سے ملک عالمی سرمایے میں اضافے سے فیض یاب نہیں ہو پا رہے ہیں۔ اقوامِ متحدہ کی ترقیاتی رپورٹ میں آگاہ کیا گیا ہے کہ اگر یہی صورتِ حال رہی تو ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کے درمیان تفریق اور خطرناک شکل اختیار کرلے گی۔ اس صورتِ حال کے لیے .W.T.O کے اصول بھی بہت حد تک ذمے دار ہیں جو زیادہ تر امیر صنعتی ملکوں کے حق میں بنائے جا رہے ہیں۔ ان زراعتی پیداواروں اور ٹیکسٹائل کے لیے بازار مہیا نہیں ہیں جنھیں پیدا کرنے میں غریب ملکوں کو مہارت حاصل ہے۔ امیر ملکوں میں کسانوں کو ان کاموں کے لیے مدد دی جارہی ہے، جن سے ماحولیات کو نقصان پہنچتا ہے۔ آج غریب ممالک کو ٹیکنالوجی کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ آب و ہوا کی تبدیلی پر کوئی بین الاقوامی معاہدہ نہیں ہوسکا ہے جس کا سب سے زیادہ برا اثر غریب ممالک پر پڑے گا۔ حالات میں سدھار کے لیے ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ایک اندازے کے مطابق 25 سال میں دنیا کی آبادی میں دو ارب کا اضافہ ہوجائے گا۔ چیلنج اور بڑے ہوں گے، ذرائع پر اور زیادہ بوجھ پڑے گا اور کامیابی ملنی مشکل ہوگی۔ یہ طے ہے کہ سیاست اور معاشیات دنیا کے مسائل کو موجودہ ٹیکنالوجی سے حل نہیں کرپائیں گے۔

اقوامِ متحدہ نے اپنے ملینیم ترقیاتی ہدف میں سبھی کو اناج، صاف پانی اور بنیادی تعلیم مہیا کرانے کا وعدہ کیا ہے۔ اس ہدف کو پورا کرنے کے لیے امیر ملکوں سے ہر سال 40 سے 60 ارب ڈالر کی امداد کی ضرورت ہوگی، جو ملنی مشکل ہے۔ پھر موجودہ ٹیکنالوجی سے ہر ایک کے لیے حقیقی ترقی ممکن نہیں ہوگی۔ لہٰذا اسے نئے طریقۂ کار کی ضرورت ہوگی۔ سائنس اور ٹیکنالوجی نے دنیا کو ایک عالمی گاؤں میں تو بدل دیا لیکن اس کے بے شمار مسائل کو سمجھنا اور حل کرنا بھی اب اسی کی ذمے داری ہے۔

(بشکریہ "نوبھارت ٹائمس" نئی دہلی-16/اکتوبر 2003)

تحریکِ خلافت

مصنف: قاضی محمد عدیل عباسی

ہندستان میں چلائی جانے والی تحریکِ خلافت نے بالواسطہ طور پر ہماری تحریکِ آزادی کو بھی ایک نئی قوت عطا کی تھی۔ اس کتاب میں مصنف نے جو اس تحریک میں شریک تھے، تحریکِ خلافت کے تمام پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

دوسرا ایڈیشن، ڈیمائی، 219 صفحات، قیمت 65.00 روپے

تالستائے

مصنف: ڈاکٹر محمد یٰسین

تالستائے کی تصانیف ہمیں خواب و خیال کی دنیا سے حقیقت کی طرف لے جاتی ہیں۔ اس کے یہاں حیات و کائنات کا عرفان بھی ہے اور عام انسانی جذبات و احساسات کی عکاسی بھی۔ اس کتاب میں تالستائے کے سوانحی گوشوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کے فنی کارناموں پر بھی۔

دوسرا ایڈیشن، ڈیمائی، 152 صفحات، قیمت 46.00 روپے

بابر نامہ

تلخیص کار اور مترجم: ڈاکٹر محمد قاسم صدیقی

"تزکِ بابری" کی تلخیص اور آسان اردو میں ترجمہ۔ یہ تلخیص ان حصوں پر مشتمل ہے جن میں بابر نے بہ طور خاص ہندستان کے رسم و رواج، یہاں کے موسموں، یہاں کی آب و ہوا یہاں کے پھلوں اور پھولوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب بچوں کے لیے خصوصی دلچسپی کی حامل ہے۔

دوسرا ایڈیشن، ڈیمائی، 101 صفحات، قیمت 15.00 روپے

برنارڈ شا

مصنف: عبدالمغنی

جارج برنارڈ شا ایک روشن خیال اور انسان دوست ادیب اور مفکر تھا جو نسل یا قومیت کی حد بندیوں سے نکل کر پورے عالمِ انسانیت کی بہتری کا خواہاں تھا۔ اس کتاب میں برنارڈ شا کے شخصی اور ادبی اوصاف تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔

دوسرا ایڈیشن، ڈیمائی، 96 صفحات، قیمت 35.00 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

بھارت جھن جھن والا

چھوٹی فصلیں اور سرکاری امداد

بھارت سرکار نے گیہوں، دھان، گنا، ناریل اور جوٹ کی پیداوار کے لیے سرکاری قیمتیں طے کررکھی ہیں۔ ان فصلوں کی قیمت کم ہونے پر سرکار انھیں خریدتی ہے یا دوسرے خریداروں کو مناسب قیمت دینے کے لیے مجبور کرتی ہے۔ اس طرح ان فصلوں کی قیمتیں مستحکم رہتی ہیں اور کسان قیمتوں کے تئیں مطمئن رہتے ہیں اور ان فصلوں کی پیداوار میں بھی استحکام برقرار رہتا ہے۔ لیکن یہ پالیسی چھوٹی فصلوں مثلاً باجرا، مونگ پھلی، سرسوں، مکا، راگی وغیرہ کے لیے نہیں ہے۔ ان چھوٹی فصلوں کی پیداوار اکثر خشک علاقے کے غریب ترین کسانوں کے ذریعے کی جاتی ہے۔ سرکاری امداد نہ ملنے کے سبب ان کسانوں کی حالت بگڑتی جارہی ہے۔ سرکار کو ان چھوٹی فصلوں کی قیمت کا بھی تعین کرنا چاہیے۔

سرکاری قیمت طے ہونے سے کسانوں کا رجحان گیہوں اور چاول کی پیداوار کی طرف زیادہ ہوتا ہے۔ اس سے ہماری زراعت میں مختلف فصلوں کی پیداوار ختم ہورہی ہے۔ راجستھان میں باجرا، مونگ اور موٹھ پیدا ہوتی ہے۔ کرناٹک اور آندھرا میں راگی پیدا کی جاتی ہے۔ گجرات میں مونگ پھلی اور مہاراشٹر میں مکا کی پیداوار ہوتی ہے۔ ان چھوٹی فصلوں کو پیدا کرنے والے کسانوں کو خوف رہتا ہے کہ قیمتوں میں بہت گراوٹ نہ آجائے۔ اس لیے ہر خطے میں گیہوں اور چاول کی پیداوار بڑھ رہی ہے خواہ اس علاقے کی آب و ہوا مناسب ہو یا نہیں۔

بھارت سرکار نے کچھ عرصہ پہلے ابھیجیت سین کمیٹی کو ملک کی سرکاری قیمتوں سے متعلق پالیسی کا مطالعہ کرنے کی ہدایت دی تھی۔ اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں کہا تھا" ہندستان کی ترقی کے اس دور میں زراعت میں فصلوں کے مختلف النوع ہونے کی اہمیت بہت ہے۔ موجودہ سرکاری خریداری اور قیمت کی پالیسی کے سبب کسان گیہوں اور چاول کی پیداوار زیادہ کررہے ہیں جب کہ ان اناجوں کے بڑے اسٹاک موجود ہیں۔ وہ تلہن جیسی فصل کی پیداوار کم کررہے ہیں جن کے خوردنی تیلوں کو ہمیں درآمد کرنا پڑتا ہے، ہمارے خوردنی تیلوں کی پیداوار کم ہے اور کھپت زیادہ۔ اس لیے ہمیں سرسوں اور مونگ پھلی کی پیداوار بڑھانی چاہیے لیکن ان فصلوں کی قیمتوں میں استحکام نہیں رہتا ہے۔ اس لیے کسان ان کی پیداوار کرنے سے کتراتا ہے۔ دوسری طرف ہمارے پاس گیہوں اور دھان کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ لہٰذا ہمیں ان کی پیداوار کم کرنی چاہیے۔ پھر بھی کسان ان کی پیداوار ہی زیادہ کرتا ہے کیونکہ وہ ان کی قیمتوں کے تئیں مطمئن ہے۔ ہماری سرکاری خریداری پالیسی کا نتیجہ یہ ہورہا ہے کہ جن اناجوں کی زیادتی ہے انھی کی پیداوار روز بروز بڑھ رہی ہے اور جن تلہنوں کی ضرورت ہے ان کی پیداوار کم ہورہی ہے۔ اس لیے ابھیجیت سین کمیٹی نے سفارش کی تھی کہ" زراعت کی انواع و اقسام کو ترغیب دینے کے لیے دوسری فصلوں کے لیے بھی سرکاری خریداری قیمت پالیسی نافذ کرنی چاہیے۔ مرکزی حکومت کو ریاستی سرکاروں سے بات چیت کرکے کچھ فصلوں کی نشاندہی کرنی چاہیے اور خاطر خواہ رقم فراہم کرکے ان کی قیمتوں کو اپنی حمایت دینی چاہیے۔ چند سال قبل امریکہ میں" کان بلائڈ' نام کا مرض پھیل گیا تھا۔ امریکہ میں مکا کی فصل تقریباً پوری طرح برباد ہوگئی تھی۔ امریکہ میں بڑے پیمانے پر مکا کی کھیتی ہوتی ہے۔ اسے وہاں جانوروں کو کھلایا جاتا ہے— مختلف النوع فصلوں سے ہم اس طرح کے بحران سے بچ سکتے ہیں۔ اگر پورے ملک میں گیہوں کی فصل بیماری کا شکار ہوجائے تو بھی ہمارے پاس دیگر اناج موجود رہیں گے۔ اس لیے زراعت ہمہ جہتی اناج کے تحفظ کے نظریے سے خاص اہمیت کی حامل ہے۔ چھوٹی فصلوں کی قیمتوں کو طے کرنے کا دوسرا پہلو خشک سالی سے متاثرہ کسانوں کی بگڑتی حالت ہے۔ باجرہ، راگی اور مونگ پھلی اکثر سوکھے علاقوں میں پیدا کیے جاتے ہیں۔ ان علاقوں کے کسان بارش پر منحصر رہتے ہیں۔ کبھی قحط پڑ جاتا ہے تو بکائی اور بوائی کا خرچ بھی نہیں نکل پاتا ہے۔ ان کسانوں کی اقتصادی حالت کمزور ہوتی جارہی ہے۔ لیکن وزارت زراعت کا کہنا ہے کہ کسی فصل کو امداد دینے کے لیے اس کا خاطر خواہ مقدار میں پیدا ہونا ضروری ہے۔ چنے اور مٹر جیسی چھوٹی چھوٹی فصلوں کو سرکاری امداد دی جائے تو سیکڑوں فصلوں کو سنبھالنا مشکل ہوجائے گا۔ وزارت کی دلیل ہے کہ یہ مختلف النوع فصلوں کے مقصد کے بھی پوری طرح برعکس ہے۔ مختلف النوع ہونے کا مطلب ہوتا ہے کہ مختلف فصلوں کو پیدا کیا جائے۔ جتنی فصلوں کی قیمتوں کو سرکاری امداد دی جائے گی اتنی ہی مختلف فصلوں کی پیداوار بڑھے گی۔ یہ دلیل" نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی" کے مترادف ہے۔ باجرا اور مکے کی قیمتوں کو سرکاری امداد حاصل نہیں ہے۔ اس لیے ان کی پیداوار کم ہوتی ہے اور پیداوار خاطر خواہ مقدار میں نہ ہونے سے سرکار انھیں امداد نہیں دیتی ہے۔ لہٰذا سرکار کی طرف سے چھوٹی

فصلوں کو امداد دے کر ان کی پیداوار بڑھانے میں تعاون کی ضرورت ہے۔

وزارتِ زراعت کی دوسری دلیل یہ ہے کہ مرکزی حکومت کسی فصل کو اس صورت میں امداد دے گی جب اس کی پیداوار کئی ریاستوں میں ہوتی ہو۔ یہ دلیل بنیادی طور پر ناقابلِ تسلیم ہے۔ راجستھان میں باجرا اور ہماچل میں مکا بڑے پیمانے پر پیدا ہوتی ہے۔ مرکزی حکومت کی ان کسانوں کے تئیں بھی اتنی ہی جوابدہی ہے جتنی کہ گیہوں پیدا کرنے والے کسانوں کے لیے۔ مرکزی حکومت جوٹ کے لیے سرکاری قیمتوں کا اعلان کرتی ہے جس کی 85 فیصد پیداوار مغربی بنگال میں ہوتی ہے۔ اسی طرح کوپڑا (ناریل) کی 65 فیصد پیداوار تامل ناڈو اور کیرالہ میں ہوتی ہے۔ یہی سہولت باجرا، مکا اور مونگ پھلی کو بھی ملنی چاہیے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جن فصلوں میں بڑے صنعت کاروں کے مفاد وابستہ ہیں، ان میں سرکار قیمتوں کے معاملے میں تعاون دیتی ہے۔ خواہ ان کی پیداوار ایک ہی ریاست میں کیوں نہ ہو، مثلاً جوٹ۔

وزارتِ زراعت کی تیسری دلیل یہ ہے کہ فوڈ کارپوریشن آف انڈیا کے پاس انتظامی ڈھانچہ نہیں ہے کہ تمام فصلوں کی خریداری، ذخیرہ اندوزی اور فروخت کر سکے۔ یہ دلیل بھی ناقابلِ تسلیم ہے۔ چھوٹی فصلوں کی خریداری کا کام ریاستی سرکاروں یا پرائیویٹ تاجروں کو دیا جاسکتا ہے۔ بنیادی سوال مرکزی سرکار کے ذریعے خریداری کے لیے خاطر خواہ رقم مہیا کرانے کا ہے۔

وزارتِ زراعت کی آخری دلیل یہ ہے کہ کسی فصل کو امداد دینے سے سرکار کے اوپر زبردست مالی بوجھ بڑھتا ہے۔ یہ دلیل سنجیدہ ہے۔ اگر باجرا اور مکے کی قیمتیں گرتی جائیں اور سرکار انھیں اونچی قیمتوں پر خریدتی جائے تو سرکار کے پاس ذخیرہ بڑھتا جائے گا جیسا کہ گیہوں کی سرکاری قیمت بازار بھاؤ کے مطابق نہیں بلکہ لاگت کے مطابق طے کی جاتی ہے۔ اگر گیہوں کا بازار بھاؤ چار روپے ہو تب بھی سرکار اسے چھ روپے پر خریدتی ہے۔ اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ سرکاری قیمتیں گزشتہ پانچ برسوں کے بازار بھاؤ کے برابر رکھی جائیں۔ اس برس باجرا کی فصل زیادہ ہونے پر گزشتہ پانچ برسوں کی اوسط قیمت پر سرکار انھیں خرید لے۔ جب بازار کی قیمت بڑھے تو اس مال کو بیچ دے۔ اس سے قیمتوں میں بھاری اتار چڑھاؤ سے کسان بچ جائے گا۔ سرکار پر بھی زیادہ عرصے تک بوجھ نہیں پڑے گا، چونکہ اوسط قیمت بھی آہستہ آہستہ کم ہوتی یا بڑھتی جائے گی۔ جو بھی مسئلہ ہو، اس کا حل تلاش کر کے سرکار کو چھوٹی فصلوں کی قیمتیں سرکاری سطح پر طے کرنی چاہئیں جس سے چھوٹے کسانوں کو راحت ملے اور ملک کی زراعت میں مختلف فصلوں کو پیدا کرنے کا رجحان بڑھے۔

□□□

732, Modern Society, Sector 15, Rohini,
P.B. No. 10754, Delhi-110085

اردو زبان کی تدریس

معین الدین

اردو کیسے پڑھی اور پڑھائی جائے درس و تدریس کے جدید سائنٹفک اصولوں کی روشنی میں تدریسی طریقۂ کار کا تعین طلبہ اور اساتذہ دونوں کے لیے یکساں مفید۔

پانچواں ایڈیشن

صفحات: 148 ، قیمت: 29.00 روپے

ہندستان کا شاندار ماضی

مصنف: اے ایل باشم

مترجم: سید غلام سمنانی

ہندستان کے قدیم تہذیب و تمدن کا مفصل اور مکمل تعارف مستند تاریخی شواہد کی روشنی میں

دوسرا ایڈیشن

صفحات: 748 ، قیمت: 145.00 روپے

اتر پردیش کے لوک گیت

اظہر علی فاروقی

ہمارے لوک گیتوں میں ہندوستان کی عوامی زندگی کی بھرپور ترجمانی ہوئی ہے۔ اس کتاب میں اظہر علی فاروقی نے اتر پردیش کے وہ تمام گیت یکجا کر دیے ہیں جو مختلف موقعوں پر عوام کے دکھ سکھ کی ترجمانی کرتے ہیں

صفحات: 652 ، قیمت: 120.00 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

ہریش ترویدی

سفید فام کرداروں کی خودسوزیاں

جنوبی افریقہ کے ناول نگار جان میکسویل کوئٹزی (John Maxwell Coetzee) کو پہلے ہی اس قدر ایوارڈ مل چکے تھے کہ لگ بھگ طے تھا کہ نوبل انعام بھی ان کو مل کر رہے گا۔ ان کے تیسرے ناول Waiting for the Barbarians (1980) کو چار بڑے ایوارڈ ملے۔ Life and Times of Michael K (1983) کو Booker Prize ملا اور کوئٹزی کے شہرۂ آفاق ناول Disgrace (1999) کو دوبارہ بوکر پرائز ملا اور ساتھ ہی Common Wealth ایوارڈ بھی۔

ان ناولوں کے لیے کئی بار کوئٹزی کا سیدھا مقابلہ ہمارے سلمان رشدی کے ساتھ رہا ہے۔ 12 سال کے بن باس کے بعد 2000 میں رشدی ہندستان اس لیے لوٹے تھے کہ اس سال کے کامن ویلتھ ایوارڈ کی تقریب میں وہ شرکت کر سکیں۔ مگر وہ ایوارڈ کوئٹزی کو ملا، جو دہلی آئے بھی نہیں تھے۔ مجھے یاد ہے، جب اوبرائے انٹرکنٹی نینٹل ہوٹل میں منعقدہ عشائیہ پر ایوارڈ کا اعلان ہوا تو رشدی دم بخود رہ گئے۔ گلاس اٹھا کر انھوں نے پانی کے ایک دو گھونٹ پیے اور پھر دھیرے دھیرے تالی بجانے لگے۔ چند ماہ قبل بوکر پرائز والے عشائیہ میں تو جب کوئٹزی کے نام کا اعلان ہوا تو رشدی عشائیہ بیچ میں چھوڑ کر واپس چلے گئے تھے، جبکہ کوئٹزی وہاں بھی نہیں آئے تھے۔ دہلی میں اگلے روز رشدی نے طنزاً کہا۔ "آتے جاتے کہیں ہیں نہیں، بس جیتتے چلے جاتے ہیں۔"

کوئٹزی کس قسم کے قلم کار ہیں، یہ جاننا ہے تو موٹے طور پر سمجھ لیجیے کہ وہ رشدی کے اُلٹ ہیں۔ جہاں رشدی پانچ سو صفحات کے ضخیم ناول کی تخلیق کرتے ہیں، جنھیں کئی قاری ختم ہی نہیں کر پاتے، وہیں کوئٹزی کے پتلے سے چھریرے ناولوں کو ایک سانس میں پڑھ جانے کا دل کرتا ہے۔ جہاں رشدی کے ناول میں کرداروں، واقعات اور فروعی واقعات کی بھرمار رہتی ہے، وہاں کوئٹزی کی اسکرپٹ منظم اور کسی ہوئی ہوتی ہے۔ رشدی کے چلبلے اور مرصع اندازِ بیان میں جہاں لگتا ہے کہ لگاتار پھلجھڑی، پٹاخے چھوٹتے چلے جا رہے ہیں، وہیں کوئٹزی کی زبان دیے کی لو کی طرح ساکت اور نالرزاں ہے۔ الفاظ سے کھلواڑ تو جیسے ان کے ایمان کے خلاف ہو۔ رشدی کے کردار تاریخ کے ساتھ ہتھکڑی سے جکڑے رہتے ہیں، جبکہ کوئٹزی کے کردار تاریخ کے طوفان سے جان بچاتے ہوئے کسی طرح گرتے پڑتے کہیں دور کونے میں جا کر سر چھپاتے ہیں۔ رشدی ہر دم سرخیوں میں چھائے رہتے ہیں، کوئٹزی کہیں آتے جاتے نہیں۔ یہ محض اتفاق ہی تھا کہ دو سال قبل کینبرا (آسٹریلیا) میں ایک بڑی کانفرنس میں انھوں نے نہ صرف تقریر کی، بلکہ اپنی تخلیق بھی سنائی۔ تقریر میں انھوں نے انسانی قدروں کے زوال پر تشویش کا اظہار کیا اور کہا کہ Renaissance کے وقت ہی ہم نے کچھ غلط موڑ لے لیے تھے جس کا یہ نتیجہ ہے۔ اپنی تخلیق سنانے کے لیے انھوں نے اپنی آپ بیتی نما کتاب Youth (2001) سے ایک حصہ پڑھا جس میں لندن میں رہنے والے گمنام سے ایک ہندستانی کمپیوٹر پروگرامر کا بیان تھا جو اپنے ہنر کا استاد ہے۔ سب سے الگ تھلگ رہتا ہے، کہیں آتا جاتا نہیں۔ یہاں تک کہ بیچ بیچ میں آفس بھی نہیں آتا۔ اس ہندستانی کردار کو کوئٹزی نے اتنی باریکی سے پکڑا تھا کہ بعد میں ہال سے نکلتے وقت میں نے کوئٹزی سے کہا۔ "اگر بیرونِ ملک میں بسے ہندستانیوں کی آپ اتنی اچھی کردار نگاری کرنا شروع کر دیں گے تو رشدی جیسے ہمارے اپنے غیر مقیم قلم کاروں کے لیے کرنے کو کیا بچے گا؟" سن کر وہ بہت مہین سا مسکرائے، بولے کچھ نہیں۔ اور پھر باقی پانچ روز اس کانفرنس میں کسی کو دوبارہ نظر نہیں آئے۔

جنوبی افریقہ میں 1940 میں پیدا ہوئے کوئٹزی 20 سال کے تھے جب شارپ وِل میں نسلی امتیاز والی حکومت نے سیاہ فاموں پر جم کر گولی چلائی جس میں 70 سے زائد افراد جاں بحق ہوئے۔ تبھی کوئٹزی بیرونِ ملک چلے گئے۔ پہلے انگلینڈ اور پھر امریکہ۔ جہاں ٹکساس یونیورسٹی میں انھوں نے کمپیوٹر لینگویج میں پی ایچ ڈی حاصل کی۔ جب انھیں امریکی ویزا اور گرین کارڈ نہیں ملا تو وہ واپس جنوبی افریقہ لوٹے اور کئی سال کیپ ٹاؤن یونیورسٹی میں انگریزی پڑھاتے رہے۔ ان کے کئی ناولوں پر پہلے کے قلم کاروں کا اثر نمایاں ہے۔ ڈینیل ڈیفوکا، کافکا کا، سیموئل بیکٹ کا بھی۔

مگر ان اثرات سے پرے کوئٹزی کی نفسیات کی اپنی ایک انفرادیت ہے اور ان کے اپنے افکار بھی۔ جنوبی افریقہ کی سابقہ ظالم حکومت کے دور میں رہتے ہوئے اپنے جیسے کئی اعتدال پسند سفید فاموں کی دکھی آتما کو کوئٹزی نے آواز دی ہے۔ ان کے ناولوں میں سیاہ فام کرداروں کے تئیں امتیاز اور بدسلوکی کی سیدھی تصویر کشی تو نہیں ملتی، تاہم ایسے سماج کی اتھل پتھل میں اپنے پیر کہیں جمانے میں ناکام سفید فام کرداروں کی مصیبتیں اور ان کا لگاتار اور

زیادہ پستی میں گرتے جانا ضرور نظر آتا ہے۔ کوئٹزی کا معرکہ آرا ناول 'ڈسگریس' جنوبی افریقہ میں سفید فام حکومت کے زوال اور منڈیلا اور اے. این. سی. کی جمہوری حکومت کی تشکیل کے بعد لکھا گیا ان کا پہلا ناول ہے۔ اس کے کردار ہیں 52 سالہ ڈیوڈ لیوری، جو انگریزی کے پروفیسر ہیں اور اپنی ایک طالبہ (سفید فام) کو بہلا پھسلا کر اس کے ساتھ جسمانی رشتہ قائم کرنے کی پاداش میں ملازمت سے برخاست کر دیے جاتے ہیں۔ عنوان کا 'کلنک' یہی ہے۔ پھر وہ اپنی Hippy Lesbian بیٹی، لوسی کے ساتھ رہنے چلے جاتے ہیں جو شہری کلچر چھوڑ کر دھرتی سے ناطہ جوڑنے کے لیے دیہات میں رہ کر کھیتی کرتی ہے۔ یہاں ایک روز تین سیاہ فام آتے ہیں اور لوسی کے ساتھ زنا بالجبر کرتے ہیں۔ لیکن لوسی نہ ان کی رپورٹ لکھواتی ہے، نہ کسی طرح کا انتقام چاہتی ہے۔ اس کو لگتا ہے کہ سیاہ فاموں کے ملک میں اس نئے نظام میں اگر سفید فاموں کو رہنا ہے تو یہ سب تو ہوگا ہی۔

ڈیوڈ لیوری اس سے اتفاق نہیں کرتے اور بیٹی کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ ملک چھوڑ کر اپنی ماں کے پاس ہالینڈ چلی جائے۔ لیکن خود انھوں نے ایک چھوٹی سی نوکری کر لی ہے جس میں آوارہ کتوں کی 'مارے جانے کے پہلے' دیکھ بھال کرنی ہوتی ہے۔ پروفیسری سے گر کر اب وہ 'ہریجن' ہو گئے ہیں۔ (اس ہندستانی لفظ کا خود کوئٹزی استعمال کرتے ہیں۔) ان کو اپنے کیے کا افسوس تو نہیں ہے، مگر شاید ایک دھندلا سا احساسِ جرم ہے، جسے مٹانے کے لیے وہ ایسی حالت میں پڑے رہنا ہی مناسب سمجھتے ہیں۔

یہ ناول جب میں نے دہلی یونیورسٹی میں اپنی ایم فل کلاس میں پڑھایا تو طلبہ و طالبات نے کئی پیچیدہ سوال اٹھائے۔ اگر ڈیوڈ لیوری بھی گورے ہیں اور ان کی معشوق طالبہ بھی گوری ہے تو یہ واقعہ جنوبی افریقہ کے باہر بھی کہیں پیش آ سکتا ہے۔ لوسی کے تینوں زانی کرداروں کی جسمانی تصویر کشی کوئٹزی ایسے کیوں کرتے ہیں کہ فوراً پتہ نہ چلے کہ وہ سیاہ فام ہیں؟ کیا وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ زانی ہیں تو ضرور ہی سیاہ فام ہوں گے؟ کیا وجہ ہے کہ اس ناول کے تھوڑے سے سیاہ فام کردار عیار ہیں اور بے دھڑک ہیں، جبکہ سفید فام کردار بھلے ہیں، بے چارے ہیں اور اپنی نرم روی کی وجہ سے مظلوم ہیں؟ آخر یہ ناول کہنا کیا چاہتا ہے، اس کی سیاست کیا ہے؟

میری کلاس میں بھلے ہی اس بابت اختلاف رائے رہا ہو، مگر جنوبی افریقہ کی نئی حکومت کی نظر میں معاملہ بالکل صاف تھا۔ کئی کابینہ وزرا نے اس ناول کو سراسر نسل پرست ٹھہرایا اور کوئٹزی کی مذمت کی۔ بعد ازاں کوئٹزی نے فیصلہ کیا کہ وہ اب جنوبی افریقہ میں نہیں رہیں گے۔ وہ جا کر آسٹریلیا میں بس گئے ہیں اور سال میں کچھ مہینے شکاگو یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں۔ ہجرت کی شاید یہ ایک نئی مثال ہے، جس میں قلم کار کی پٹری نہ ظالم غیر ملکی حکومت کے ساتھ بیٹھی اور نہ اپنی آزاد حکومت کے ساتھ۔ شاید اس لیے کہ قلم کار ہمدرد چاہے جتنا ہو، ہے تو خود غیر ملکی ہی۔

دنیا میں اب تک جنوبی افریقی ادب اپنے اعتدال پسند سفید فام قلم کاروں کے ذریعے ہی جانا جاتا رہا ہے، خواہ وہ ندین گارڈیمر ہوں، جنھیں 1991 کا نوبل ایوارڈ ملا تھا یا کوئٹزی۔ مگر اب انتظار رہے گا کسی ایسے دھرتی پتر سیاہ فام قلم کار کا جو اپنی کہانی اپنی ہی زبان میں کہے گا اور (رگھوویر سہائے کے لفظوں میں) رکھ دے گا 'ہر دے سر وہارا کا کھول کر'۔

(بشکریہ "اردو نامہ" پٹنہ، 19/اکتوبر 2003)

انتخاب غزلیات میر

ڈاکٹر حامدی کاشمیری

میر تقی میر کی شاعری کا منظر نامہ شخصی زندگی کی حدوں کو سمیٹتا ہوا ایک آفاقی انسانی صورت حال کو ابھارتا ہے جس میں سایوں اور روشنیوں کی ایک طلسمی دنیا آباد ہے۔

دوسری اشاعت

255 صفحات قیمت: 62 روپے

اردو کی کہانی

سیّد احتشام حسین

بچوں کی تعلیمی ضروریات نیز تعلیم بالغاں کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر اس طرح لکھی گئی ہے کہ اردو زبان و ادب کی تاریخ ابتدا سے موجودہ دور تک ایک تسلسل کے ساتھ سامنے آ جائے۔ کتاب میں اہل قلم کی 61 تصویریں بھی ہیں۔

دوسرا ایڈیشن

104 صفحات قیمت: 21 روپے

انسانی شخصیت کے اسرار و رموز

پروفیسر ساجدہ زیدی

علم النفسیات کا سب سے اہم پہلو شخصیت کی نفسیات ہے۔ اس کتاب میں انسانی شخصیت کے کرداری، تحرکی، جبلی، فعلی اور امکانی عناصر اور ان کی نمو پذیر شخصیت کی پردہ کشائی کی کوشش کی گئی ہے۔

پہلی اشاعت

456 صفحات قیمت 123 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

دنیا میں جہاں بھی جاتا ہوں وہاں مجھے اپنے سیاسی موقف کی غلط تصویر کا سامنا کرنا پڑتا ہے: ایڈورڈ سعید

میری زندگی میں اجنبیت اور بے جوڑ پن کے احساسات ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ یعنی یہ کہ میں باہر کا آدمی ہوں۔ لیکن صرف باہری آدمی نہیں، بلکہ میں ایسا آدمی بھی ہوں، جس کے لیے، وقت کے گزرنے کے ساتھ، واپس لوٹ کر جانے کے لیے جگہیں کم ہوتی چلی گئی ہیں۔ میں فلسطین واپس نہیں جاسکتا۔ اس کی وجہیں بالکل ظاہر ہیں، اور ان میں زیادہ تر سیاسی ہیں۔ جس مصر میں میرا لڑکپن گزرا، میں اس مصر میں واپس نہیں جاسکتا [یعنی وہاں کے سیاسی حالات بدل گئے ہیں] اور اب میں لبنان بھی واپس نہیں جاسکتا جہاں میری ماں رہتی ہیں اور جہاں کی میری بیوی ہیں۔ میری زندگی کا پس منظر جگہوں کو ترک کرنے اور جگہ سے بے جگہ ہونے کے سلسلوں سے عبارت ہے، ایسے سلسلے جن کے نشانات اور اثرات اب ختم بھی نہیں کیے جاسکتے۔ دو تہذیبوں کے درمیان وجود رکھنے کا احساس مجھ میں شدید، بہت شدید رہا ہے۔ میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ سب سے مضبوط دھاگا جو میری زندگی میں رواں رہا ہے، وہ یہی ہے کہ میں چیزوں اور جگہوں میں داخل ہوتا اور پھر نکلتا رہا ہوں۔ میں بہت دیر تک کہیں کا کسی چیز کا نہیں رہ سکا ہوں۔

میں ادب کا طالب علم اس لیے بنا کہ مجھے ہمیشہ ادب سے دلچسپی رہی ہے۔ اور اس وجہ سے بھی میں ادب کا طالب علم بنا کہ جو چیزیں ادب کے گرد و پیش میں ہیں، جیسے فلسفہ، موسیقی، تاریخ، سیاسیات اور سماجیات ان کی وجہ سے ادب کا طالب علم اور بھی کئی انسانی عوامل اور محرکات میں دلچسپی لے سکتا ہے۔

ایڈورڈ سعید (پیدائش 1935) کی موت ایک عالم کو افسردہ کر گئی۔ انھوں نے ادبی تنقید اور ثقافتی تاریخ و فلسفہ میں لازوال نقوش چھوڑے اور فلسطین کے مقصود کے لیے ان کی جدوجہد اور بے خوف جنگ نے انھیں ساری دنیا کے مظلوم اور بے دخل کیے ہوئے لوگوں کا ہیرو بنا دیا تھا۔ ایڈورڈ سعید کو 1948 میں اپنا گھر یروشلم چھوڑنا پڑا جب اسرائیلی حکومت نے وہاں کے لوگوں کو بے دخل کر کے ترک وطن پر مجبور کیا۔ قاہرہ اور امریکہ میں تعلیم پانے کے بعد وہ کولمبیا یونیورسٹی، نیویارک میں انگریزی کے استاد مقرر ہوئے اور بعد میں "یونیورسٹی پروفیسر" کے عہدے سے سرفراز ہوئے۔ انھوں نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب Orientalism (مطبوعہ 1978) میں دکھایا کہ "مستشرق" حضرات نے بھی مغربی سامراج کی اتنی ہی خدمت کی ہے جتنی مغربی سیاست دانوں نے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ مستشرقین کا علم اور ان کے مطالعات بھی اقتدار قائم کرنے، اقتدار قائم رکھنے، اور مشرق کو مجہول و محکوم بنائے رکھنے کے عمل میں معاون رہے ہیں۔ اس کتاب پر واویلا بہت ہوا لیکن اس نے گذشتہ پچیس سال کی مغربی اور مشرقی فکر پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ ایڈورڈ سعید نے اپنے مخصوص طرز فکر کو کام میں لاتے ہوئے Beginnings اور The World, The Text, and The Critic اور Culture and Imperialism جیسی کتابوں کے ذریعہ خود کو اس زمانے کے اہم ترین نقادوں میں تسلیم کرایا۔ انھوں نے اپنی خودنوشت Out of Place میں جلاوطنی، عرب تشخص، اور دہشت گردی کے بارے میں بھی خیالات پیش کیے۔ ایڈورڈ سعید کا بیٹا ودیعہ بھی ان کی طرح فلسطینی مقصود کے لیے گرم عمل ہے۔ ہم مرنے والے کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں۔

[جہاں تک فلسطین کو واپسی کا امکان ہے تو] میں نے اس پر بہت سوچا ہے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ میں واپس جاسکوں گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یروشلم کے جس حصے کا میں ہوں، یعنی مغربی حصے کا، تو وہ شروع ہی سے بعد 1948 کے اسرائیل کا ایک حصہ رہا، اور یروشلم کا وہ علاقہ ایسا نہیں ہے جہاں میں بآسانی مراجعت کرسکوں گا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جلاوطنی کا احساس اور اس کا تصور مجھ میں اب اس قدر شدید اور پرقوت ہے کہ میں اس طرح کی کسی مراجعت کے ذریعے اسے ٹھنڈا یا نرم نہ کرسکوں گا۔

اور بہر حال، میرا تو خیال یہ ہے کہ میں کسی ایسے فلسطین میں یقین نہیں رکھ سکتا ہوں جس کا وجود ہی تقسیم ملک کا مرہون منت ہو۔ میں نے یہ خیال بالکل ترک کردیا ہے کہ سیاسی مسائل کا حل یہ ہے کہ علاقوں اور خطوں کو چھوٹے، اور پھر اور بھی چھوٹے حصوں میں بانٹ دیا جائے۔ تقسیم پر میرا اعتقاد نہیں ہے، نہ تو سیاسی سطح پر، نہ انسانی آبادی کی سطح پر، اور نہ ہی کسی بھی قسم کی ذہنی یا روحانی سطح پر۔ یہ سارا تصور ہی سرے سے غلط ہے کہ قوموں اور معاشروں کے حصے بخرے کیے جائیں۔ برابری کا کوئی بھی تصور، کہ زمین کا

● گزشتہ شمارے میں ہم نے عہد ساز نقاد اور Activist ایڈورڈ سعید کی رحلت کے عظیم سانحے پر انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے دو مضامین شائع کیے تھے۔ معاصر مقتدر جریدے "شب خون" کے شمارہ نمبر 273 بابت اکتوبر 2003 میں ایڈورڈ سعید کی موت پر شائع شدہ ادارتی نوٹ اور خود ایڈورڈ سعید کے انٹرویو (1986 میں شائع شدہ) کا ایک حصہ ہم اس شمارے میں ماہنامہ "شب خون" کی شکریے کے ساتھ قارئین کی خدمت میں پیش کررہے ہیں۔

فلاں فلاں حصہ فلسطینی یا اسرائیلی وطن کدہ ہے، مجھے بالکل جھوٹا اور غیر حقیقی معلوم ہوتا ہے۔ بے شک میں اس بات کے حق میں ہوں کہ لوگوں کو اپنا سیاسی مستقبل خود طے کرنا چاہیے، لہٰذا اگر کوئی معاشرہ یا قوم تقسیم چاہے تو ٹھیک ہے، اسے تقسیم ہونے دیجیے۔ لیکن میں اس بات کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا کہ میں اس کارگزاری میں شریک ہوں۔

اگر نارتھرپ فرائی (Northrop Frye) اور دریدا (Jacque Derrida) کا مسئلہ یہ ہے وہ دنیا میں، لوگوں کے درمیان، اپنی زندگیاں یوں گزارتے ہیں کہ وہ جہاں بھی جاتے ہیں انھیں ان کے اپنے ہی خیالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں دنیا میں جہاں بھی جاتا ہوں وہاں مجھے اپنے سیاسی موقف کی غلط تصویر کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میں اگر کسی ادبی یا واضح طور پر غیر سیاسی موضوع پر بھی لیکچر دینے جاؤں تو بھی ہمیشہ تشدد کا خطرہ موجود رہتا ہے۔

مجھے جس چیز میں دلچسپی ہے وہ نارتھرپ فرائی (Northrop Frye) کے بیان کردہ ادب سے نہیں ہے، کہ ادب الگ ہی سے ایک مکمل نظام ہے۔ نہیں، مجھے ادب سے دلچسپی اس لیے ہے کہ وہ اور بھی کئی چیزوں سے وابستہ ہے، اور آپ چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ وابستگی کے طریقے مسحور کن ہیں۔ اس بات سے کوئی انکار نہ کرے گا کہ مثلاً کیٹس (Keats) کی ایک اوڈ (Ode) یا والیس اسٹیونس (Wallace Stevens) کی ایک نظم میں ادبی صفات ہیں۔ لیکن کیا وہ ادبی صفات اپنے اندر، اور اپنی حیثیت سے خود مکتفی اور دلچسپ ہیں، اور کسی شخص کے ذاتی لطف اور مسحوریت کے علاوہ ان میں کچھ نہیں؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ لطف اندوزی شاید اپنی جگہ پر کافی ہو، لیکن اگر ہم ان صفات کے بارے میں بات کرنا چاہیں گے تو ہم ان صفات کو دوسری چیزوں سے مربوط کر کے اپنی لطف اندوزی میں اضافہ ہی کر سکتے ہیں۔

□□□

دیوناگری اور تصویروں کی مدد سے اردو سکھانے والی کتاب

اردو تصویری لغت مع ہندی

جدید طریقوں سے تیار کردہ کتاب۔ اردو سیکھنے کے شائق حضرات کے لیے نہایت عمدہ تحفہ۔ تصاویر اور ہندی کی مدد سے اردو خود بخود سیکھی جا سکتی ہے۔ یہ اپنی طرز کی بالکل اچھوتی کتاب ہے۔ بہترین کتابت اور آفسیٹ کی طباعت کے ساتھ۔

سائز: 23x38/8 صفحات: 252 قیمت: -/30 روپے

حیاتِ جاوید

الطاف حسین حالی

سرسید احمد خاں کے رفیق کار مولانا الطاف حسین حالی کے قلم سے سرسید احمد خاں کی زندگی کے حالات اور ان کی قومی اور مذہبی خدمات کا بیان —

چوتھا ایڈیشن

صفحات: 907، قیمت: 167.00 روپے

اردو ادب کی تنقیدی تاریخ

سید احتشام حسین

اردو ادب کی تمام اصناف کا مختصر مگر جامع تعارف، تاریخی حوالوں کے ساتھ

طلبہ کے لیے بہ طور خاص کارآمد —

چوتھا ایڈیشن

صفحات: 334، قیمت 70.00 روپے

شعریات

ارسطو کی بوطیقا کا ترجمہ اور تعارف

شمس الرحمٰن فاروقی کے قلم سے

ہر ادبی لائبریری میں اس کتاب کی موجودگی ضروری ہے

تیسرا ایڈیشن مع اضافۂ جدید

صفحات: 136، قیمت: 62.00 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

شہاب ظفر اعظمی

حسین الحق سے گفتگو

حسین الحق موجودہ دور کے اہم ادیب ہیں۔ ان کی پیدائش 2/نومبر 1949 کو سہسرام (بہار) میں ہوئی۔ 1981سے وہ مگدھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اب تک ان کے پانچ افسانوی مجموعے "پس پردۂ شب"، "صورتِ حال"، "مطلع"، "گھنے جنگلوں میں" اور "سوئی کی نوک پر رکا لمحہ" کے علاوہ دو ناول "بولو مت چپ رہو" اور "فرات" شائع ہوکر دادوتحسین وصول کرچکے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے تنقیدی اور صوفیانہ و مذہبی موضوعات پر بھی گراں قدر مضامین تحریر کیے ہیں۔ انہیں مختلف انعامات سے بھی نوازا جاچکا ہے۔

سوال: آپ نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کب کیا؟

جواب: لکھنے پڑھنے کا کام دس برس کی عمر سے شروع ہوگیا تھا۔ پہلی کہانی "عزت کا انتقال" صوفی بلیاوی کے نام سے ماہنامہ "کلیاں" لکھنؤ میں غالباً 65-1964 میں چھپی۔ اسی زمانے میں پہلا افسانہ "پسند" ماہنامہ "جمیلہ" دہلی میں چھپا۔ 1966 میں میں نے شفق اور فخر رضوی کے ساتھ مل کر بچوں کا ایک رسالہ "انوار صبح" سہسرام سے نکالا۔ میرا پہلا مضمون "بہار کی خبریں" پٹنہ میں غالباً 69 میں چھپا جس کا عنوان تھا "اردو شاعری پر گاندھی جی کے اثرات"۔

سوال: آپ نے وسیلۂ اظہار کے طور پر فکشن کا ہی انتخاب کیوں کیا؟

جواب: میرے خیال میں لکھنے والا خود کسی صنف کا انتخاب نہیں کرتا۔ شاید صنف لکھنے والے کا انتخاب کرتی ہے۔ کیوں کہ اختر اور نیوی، آل احمد سرور، کلیم الدین احمد، احتشام حسین، شمس الرحمان فاروقی سب نے شاعری کے انتخاب کی کوشش تو کی اور اس کے نمونے بھی پیش کیے، مگر جس صنف نے مذکورہ بالا حضرات کا اصل انتخاب کیا وہ ظاہر ہے کہ شاعری نہیں۔ سچ یہ ہے کہ یہاں لکھنے والے کی مرضی نہیں چلتی۔ خود میرا بھی یہی معاملہ ہے۔

سوال: آپ نے افسانہ نگاری کیسے شروع کی؟

جواب: میں نے جس ماحول میں ہوش سنبھالا اور پلا بڑھا وہ اس میں بڑا معاون رہا۔ میرے چھوٹے ماموں سید تسلیم الدین احمد جاسوسی ناولوں کے رسیا تھے اور ان کی الماری میں ابن صفی کے ناول بھرے پڑے تھے۔ میری پہلی نگاہ ان پر گئی، کتاب کھولی تو حیرت، تجسس اور مزاح کا ایک سمندر سا ٹھاٹھیں مارتا نظر آیا اور میں ان میں گم سا ہوگیا۔ یہ میرے میٹرک پاس کرنے سے پہلے کا زمانہ تھا۔ اسی زمانے میں میری دوستی شفق سے ہوئی۔ اس کے اندر بھی افسانے کا کیڑا کلبلا رہا تھا، وہ بھی ناولوں کا رسیا تھا۔ ہم دونوں دوست ناولوں سے آگے بڑھے تو داستانیں ہاتھ لگ گئیں۔ پھر اسی زمانے میں سہسرام کی فضا میں آج کے مشہور شاعر سلطان اختر کی آواز بلند ہورہی تھی، اور ان کی عزت وشہرت دیکھ کے رشک ہورہا تھا۔ میں ذاتی طور پر ان سے زیادہ قریب ہوگیا۔ سلطان اختر صاحب انصار لائبریری کے لائبریرین بھی تھے۔ ہم لوگ ان کے حوالے سے انصار لائبریری پہنچ گئے اور وہاں ہم لوگوں کی ملاقات نسیم انہونوی سے ہوگئی۔ نسیم انہونوی کے بعد آہستہ آہستہ ہم کرشن چندر سے ہوتے ہوئے ادبی ناولوں کی طرف مڑ گئے۔

سوال: آپ کے زیادہ تر افسانوں میں تہذیبی شکست و ریخت کی جھلکیاں ملتی ہیں اور آپ گذشتہ اقدار کے نوحہ خواں نظر آتے ہیں، ایسا کیوں؟

جواب: آپ کا پہلا بیان تو صحیح ہے کہ میرے افسانوں میں تہذیبی شکست وریخت کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ افسانہ میری نظر میں دو منطقوں پر ٹھہرا ہوا ہونا چاہیے۔ نمبر ایک انسانی تعلقات کی پر پیچ گتھیاں، نمبر دو تہذیب کا منظرنامہ۔ اس لحاظ سے تہذیب تو میرے مطالعے اور مشاہدے کا ہمیشہ سے پہلا ہدف رہی ہے۔ میں نے تہذیب کے نت نئے رنگ دیکھے ہیں۔ سہسرام میں کثرت میں وحدت کے خوب صورت عناصر و مناظر بھی موجود تھے اور چونکہ سہسرام شیر شاہ سوری کی جائے پیدائش ہے، اس لیے شیراز ہند جونپور سے سہسرام تک صدیوں ایک تعلق کی ڈور بندھی رہی جس سے دونوں ایک دوسرے سے جڑے رہے اور نتیجتاً بہار میں عظیم آباد، پھلواری شریف اور بہار شریف کی طرح سہسرام بھی علم وادب وتہذیب کا مرکز بنا رہا۔ اس کی وجہ سے جب بھی میں نے سہسرام کو دیکھا تو وہاں تہذیب کا کوئی نہ کوئی منارہ پہلے کھڑا نظر آیا پھر گرا نظر آیا۔ ظاہر ہے کہ ایسے میں میرے افسانوں میں تہذیبی شکست

وریخت کی موجودگی ایک فطری امر ہے۔ مگر میں نے حتی الامکان نوحہ خوانی سے گریز کیا ہے۔ کبھی کبھی میرا کوئی کردار اگر افسوس کا شکار بھی ہوتا ہے تو پھر دوسرا کردار یا راوی جلد ہی اس پچویشن سے کنارے ہٹ جاتا ہے۔

سوال: "فرات" شائع ہونے کے بعد زیادہ توجہ نہ پاسکا۔ مگر اب تقریباً دس برسوں کے بعد اس پر مختلف زاویوں سے تنقیدی مباحث کا دور چلا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟

جواب: ''فرات'' شائع ہونے کے بعد مسلسل چرچا میں رہا۔ 1992 سے لے کر آج تک ناولوں پر لکھے گئے مضامین کا مطالعہ کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ شمس الرحمان فاروقی، ابوالکلام قاسمی، قاضی افضال حسین اور قمر رئیس کو چھوڑ کر ایک بھی ایسا ناقد نہیں ہے جس نے ''فرات'' کا تذکرہ نہ کیا ہو۔

سوال: ادھر دو تین دہائی سے اکثر وبیشتر ناولوں میں ماضی کی طرف مراجعت زیادہ ملتی ہے۔ قرۃ العین حیدر، قاضی عبدالستار، انتظار حسین، جیلانی بانو، خدیجہ مستور اور عبدالصمد کے علاوہ خود آپ کے ناول "فرات" میں ماضی کی طرف مراجعت کی مثالیں موجود ہیں۔ آخر یہ ماضی پرستی کیوں؟

جواب: ماضی پرستی اور ماضی کی طرف مراجعت زندگی کے تئیں منفی رویہ ہے۔ اگر یہ کسی ناول میں پایا جاتا ہے خواہ وہ ''فرات'' اور ''بولو مت چپ رہو'' ہی کیوں نہ ہو تو اسے ناول نگاری کا مریضانہ نقطۂ نظر قرار دیا جانا چاہیے۔ آپ نے جن ناول نگاروں کا تذکرہ کیا ہے ان میں سے ایک ناول نگار بھی ماضی پرست نہیں ہے۔ صرف کسی حد تک انتظار حسین کے یہاں ناسٹلجیا پر زور نظر آتا ہے۔ میں نے کہیں لکھا ہے کہ انتظار صاحب شیعہ تہذیب کے زوال کی وید کے عمل میں منہمک ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے ناول ''آگے سمندر ہے'' میں نگاہ وہاں سے ہٹتی نظر آتی ہے۔ باقی بچیں قرۃ العین حیدر تو وہ ماضی کو Quote کرتی ہیں، Discuss بھی کرتی ہیں، Analyze بھی کرتی ہیں، کبھی کبھی ذرا سی دیر کے لیے اس میں گم ہوتی بھی نظر آتی ہیں لیکن ان کے قلم نے زیادہ تر ماضی کو ہوٹ کیا ہے۔ باقی ناول نگاروں کے یہاں بھی ماضی پرستی یا ماضی کی طرف مراجعت نہیں ہے۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ لکھنے کے عمل میں کبھی کبھی ماضی Device بھی بن جاتا ہے۔ مذکورہ ناول نگاروں نے اکثر وبیشتر ماضی کو ہتھیار کے طور پر ہی استعمال کیا ہے۔ خود میرے ناول ''فرات'' میں ایک کردار وقار احمد ہے جو ماضی کی طرف مڑتا نظر آتا ہے باقی تبریز، فیصل، شبلی، صبیرہ سارے کے سارے کرداروں کا سفر آگے کی طرف ہے، اور وقار احمد کی مراجعت بھی بنیادی طور پر ماضی کی طرف نہیں ہے اس ابدی رویے کی طرف ہے جسے عشق کہتے ہیں۔ وہ عشق کے حصار میں ہے اور عشق کا تحرک تو بھی بنیادی طور پر دائروی ہی ہوتا ہے۔

سوال: "اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ" میں آپ کے دونوں ناولوں کو "مابعد جدید ناول" ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، آپ اس سے کس حد تک متفق ہیں؟

جواب: میں اپنی تحریر پر دی گئی کسی رائے کو کاٹنے کا قائل نہیں۔ اگر کسی نے اسے مابعد جدید سمجھا تو سبحان اللہ۔

سوال: اکثر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ آپ کے ناول اور افسانے آپ کی خاص خانقاہی وصوفیانہ فکر کے غماز ہوتے ہیں اور یہی چھاپ فنی کمزوری بن کر ابھرتی ہے؟

جواب: میرے مجموعے ''پس پردۂ شب'' میں انیس (19) افسانے ہیں۔ ان میں سوانح حیات، چہرہ پس چہرہ، منظر کچھ یوں ہے، شاید، عکس عکس، شکستیدہ، پسِ پردۂ شب، اندھی دشاؤں کے مسافر، امرتا، بلبلہ اور صحرا کا سورج، گیارہ افسانے، ''صورتِ حال'' میں دس افسانے شامل ہیں ان میں خارپشت، چپ رہنے والا کون، چھلاوا، اس لیے، رفتہ رفتہ، دھند میں ایک نظارہ اور جانا انجانا، سات افسانے، ''مطلع'' میں سولہ افسانے ہیں ان میں امکان، ناخن سے کنواں مت کھودو، وہ بات، درد نہ جانے کوئی، کلوز اپ، گرداب زدہ، مطلع، تاریک ہتھیلیاں، چاردا آپ کہاں ہیں، ہاں نہیں، دراندازا اور طلسم مہر، تیرہ افسانے، ''سوئی کی نوک پر رُکا لمحہ'' میں نو افسانے شامل ہیں ان میں ندی کنارے دھواں، سوئی کی نوک پر رُکا لمحہ، سبرا نیم کیوں مرا، ایندھن، گم شدہ استعارے، پانچ افسانے، چار افسانوی مجموعوں میں شامل 54 افسانوں میں سے 35 افسانے اور ان کے علاوہ گونگا بولنا چاہتا ہے، نیو کی اینٹ، استعارہ، سمندر کی موت اور ایک چوہا سمندر کنارے وغیرہ کم از کم پچپن ساٹھ افسانے ایسے ضرور ہیں جو اس خیال کی تردید کرنے کے لیے کافی ہیں کہ میرے افسانوں اور ناولوں میں خانقاہی اور صوفیانہ ماحول موجود ہے مگر میں اس بات سے بھی انکار نہیں کرتا کہ میرے افسانوں اور ناولوں میں خانقاہ وتصوف ہے اور یہ ہونا بھی عین فطری ہے اگر نہ ہوتا تو غیر فطری ہوتا۔ میں اسی پس منظر سے اٹھا ہوا آدمی ہوں میں نے اس دنیا کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ میری حیثیت گھر کے بھیدی کی ہے۔

سوال: ادب میں "مابعد جدید تحریک" کے نام سے جو نئی تحریک شروع ہوئی ہے، اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا آپ اس تحریک سے متفق ہیں؟

جواب: یہ کوئی نئی تحریک نہیں ہے۔ اصل میں 1960 سے 1970 کے درمیان جدیدیت کے زیرِ اثر فنکاروں کے یہاں جو غلو پیدا ہوگیا تھا اور تجرید وابہام کو بیان کا لازمی عنصر مانا جانے لگا تھا اور شعوری طور پر سماجی سروکار کی نفی کی جانے لگی تھی، اس کے مضمرات کو میں نے اور میرے دوستوں نے 1970 آتے آتے محسوس کرلیا اور اسی لیے میرے علاوہ قمر احسن، شاہد ماہلی، عتیق اللہ، انور خاں، سلام بن رزاق، عبدالصمد بھی دوستوں نے اپنے تنقیدی مضامین یا اپنے افسانوں میں اس موضوعی اور اسلوبی Regimentation سے بچنے کی ہر ممکن

کوشش کی۔ میرے افسانوی مجموعے ''مطلع'' میں ایک افسانہ ''طلسم مہر'' موجود ہے جو ایک نفسیاتی افسانہ ہے اور جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ہم لوگوں نے 1970 کی ابتدا سے ہی جدیدیت سے آگے کا سفر اختیار کرلیا تھا۔ اسے آپ پس جدید، بعد جدید، مابعد جدید جو نام چاہیں دے لیں۔ لیکن جہاں تک سوال مابعد جدیدیت کی تحریک کا ہے، یہ ایک الگ مسئلہ ہے میرا یقین یہ ہے کہ ہر تحریر اور رجحان کو تخلیقات کے اندر تلاش کیا جانا چاہیے نہ کہ کسی تحریک و رجحان کے Dictation کے مطابق تخلیقی عمل طے پائے۔ مجھے افسوس ہے کہ مابعد جدید صورت حال ہندستان میں ابھی تک پورے طور پر پیدا نہیں ہو پائی ہے۔

سوال: افسانے میں کہانی پن اور بیانیہ کی واپسی کو مابعد جدید تحریک سے جوڑا جارہا ہے جبکہ یہی چیزیں ترقی پسند افسانوں میں بھی موجود تھیں پھر پرانے بیانیہ اور نئے بیانیہ میں کیا فرق ہے؟

جواب: ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت، بیانیہ اور کہانی پن افسانوں میں ہمیشہ موجود رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بیانیہ کبھی علامتی رہا، کبھی استعاراتی اور کبھی وضاحتی لیکن بیانیہ تو بہرحال موجود رہے گا۔ کہانی پن بھی ایک مبہم اصطلاح ہے۔ ہماری دادیاں اور نانیاں جو بیان کرتی تھیں اسے بھی کہانی کہا جاتا ہے۔ پریم چند جب ''دوبیل''، ''دنیا کا انمول رتن'' اور ''ایک ادیب کی عزت'' لکھ رہے تھے تو انھیں بھی کہانیاں کہا گیا اور ''کفن'' کو بھی کہانی قرار دیا گیا۔ کرشن چندر، منٹو، بیدی تینوں کے یہاں کہانی پن الگ الگ انداز میں موجود ہے۔ کہانی پن کا کوئی منکر نہیں رہا اور نہ ہے، مسئلہ صرف یہ ہے کہ اس کہانی پن کے سہارے جو کہانی بیان کی جائے وہ صرف عصری اور سماجی مسائل سے جڑی ہوئی ہو یا انسانی رشتوں کی پیچیدگیاں اور وجود انسانی کے ازلی و ابدی اسرار بھی کہانی کے سہارے بیان کیے جائیں یا نہیں۔ منٹو، بیدی، غلام عباس، اشفاق احمد، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین اور سریندر پرکاش سے اس ناچیز تک اردو افسانے کے اس پورے سفر میں کبھی بیانیہ اور کہانی پن غائب نہیں ہوا۔ ظاہر ہے کہ جب غائب ہی نہیں ہوا تو واپسی کا سوال کہاں اٹھتا ہے۔

سوال: کیا وجہ ہے کہ موجودہ عہد کے فکشن میں امراؤ جان ادا، ہوری اور ٹوبہ ٹیک سنگھ جیسے کردار پیدا نہیں ہورہے ہیں؟

جواب: ہر ادب جس زمانے میں لکھا جاتا ہے اس زمانے میں متنازع فیہ رہتا ہے پھر مختلف وجوہات کے تحت وہ آہستہ آہستہ اپنے آپ کو منواتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کی عصمت چغتائی نے پوم پوم ڈارلنگ لکھ کر پھبتی اڑائی، بیدی مدتوں تیسرے نمبر پر رکھے جاتے رہے، آگ کا دریا کے خلاف رسائل میں مضامین لکھے گئے، عبداللہ حسین پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ قرۃ العین حیدر کی نقل کرتے ہیں۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ کسی فن پارے کے کلاسک اور لیجینڈ بننے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ کچھ اور وقت گزرنے دیجیے، کئی کردار آپ کو لازوال نظر آئیں گے۔ ویسے یہ بھی صحیح ہے کہ یہ دور کردار کا نہیں ہے، Events کا ہے۔ کردار اس دور کی چیز تھا جب سوسائٹی Individuals کے سہارے چلتی تھی، پیغمبر اور ولی Individuals تھے۔ افلاطون، ارسطو بھی Individuals تھے، سب نے اپنی اپنی صلیب تنہا اپنے کاندھوں پر اٹھائی ہے لیکن اٹھارھویں صدی ختم ہوتے ہوتے منظرنامہ بدل گیا۔ مارکس، اینجلز، لینن، گاندھی، نہرو، مولانا آزاد یا ٹیپل ان مثالوں کے ذریعے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اب شخص کے دیو بننے کا زمانہ ختم ہو چکا۔ اب کچھ افراد مل کر کوئی ایک کارنامہ انجام دیتے ہیں۔ علی گڑھ تحریک میں سرسید اور ان کے رفقا، ترقی پسند تحریک کے عمائدین، یہ سب اس کی مثالیں ہیں۔ زندگی اور حالات کا اثر فکشن پر پڑتا ہے۔ فکشن میں بھی اب واقعات پر توجہ زیادہ ہے، کردار اپنی انفرادی سطح پر بہت کم قابل ذکر رہ گیا ہے۔

سوال: آپ اپنی تخلیقات میں نئے کرداروں کا تعلق اچانک فکشن کے مشہور کرداروں مثلاً نعیم، ابوالمنصور کمال الدین، عالیہ، عذرا وغیرہ سے جوڑ دیتے ہیں۔ یہ بالکل نئی اور آپ ہی تک محدود تکنیک ہے۔ اس تکنیک کے استعمال سے آپ کا کیا مقصد ہوتا ہے؟

جواب: بڑا متن (text) منجمد (static) نہیں ہوتا، وہ آگے بڑھتا ہے اور جیسے جانداروں میں ایک جان سے دوسری جان پیدا ہوتی ہے ویسے ہی ایک متن سے دوسرا متن پیدا ہوتا ہے۔ ''فرات'' میں تخلیقیت کا یہ منظر بھی موجود ہے۔ ''فرات'' کے کردار باوجود اس کے کہ وہ بیسویں صدی کے اواخر اور اکیسویں صدی کے اوائل میں سانسیں لیتے دکھائی دیتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ خود کو اس پورے منظرنامے سے کاٹ کر زندہ نہیں رکھ سکتے جو ان کرداروں کا Creative Past کہا جاسکتا ہے۔ اگر ''فرات'' پر ماضی کی تلاش کا الزام لگایا جاتا ہے تو ایک الزام یہ بھی لگایا جانا چاہیے کہ یہاں صرف گزرے ہوئے عہد کی طرف لوٹنے کا عمل نہیں ہے بلکہ گزرے ہوئے کرداروں کی طرف بھی لوٹنے کا عمل ہے اور یہ بات میں بہت ایمانداری کے ساتھ بتا رہا ہوں کہ یہ بھی میرا شعوری عمل نہیں ہے، تخلیقی عمل ہے جو اپنی بنت میں لاشعوری ہی ہوتا ہے۔

سوال: اردو فکشن میں اسلوب کی سطح پر مختلف تجربے ہورہے ہیں۔ آپ کے خیال میں آج کے فکشن کا اسلوب کیسا ہونا چاہیے؟

جواب: ایسا استعاراتی اسلوب جس میں ابہام و اہمال کا کوئی شائبہ نہ پایا جائے۔

سوال: کوئی افسانہ یا ناول مکمل کرنے کے بعد آپ خود کو کیسا محسوس کرتے ہیں؟

جواب: افسانہ لکھنا اب شاید کتھارسس سے بھی آگے کا کوئی عمل بن گیا

ہے ایک ایسا عمل جس پر میں قادر ہوں اور جو مجھ پر قادر ہے۔ ہر نیا افسانہ لکھ کر اچھا بھی لگتا ہے اور افسوس بھی ہوتا ہے کہ جتنا اچھا لکھنا چاہتا تھا، اتنا اچھا لکھ نہیں پایا۔

سوال: جب کوئی نقاد آپ کے کسی افسانے یا ناول پر تنقید کرتے ہوئے خامیاں اجاگر کرتا ہے یا تنقیص کرتا ہے تو آپ کیسا محسوس کرتے ہیں؟

جواب: تنقید کرتا ہے تو خوشی ہوتی ہے، تنقیص کرتا ہے تو اس ناقد پر افسوس ہوتا ہے، مجھے نظر انداز کر کے گزرتا ہے تو اس پر ہنسی آتی ہے کہ بے چارہ ٹوٹتے دیوار نہیں پڑھ پا رہا ہے۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ اردو فکشن میں کوئی نظریہ حاوی نہیں ہے۔ نئے نظریات کی گفتگو ہوتی بھی ہے تو اس کے اثرات صرف شاعری میں تلاش کیے جاتے ہیں۔ ایسا کیوں؟

جواب: نئی زمانہ شاعری بھی کسی نظریے کے تحت نہیں کی جا رہی ہے اور اچھی شاعری تو کسی نظریے کے تحت کی ہی نہیں جا سکتی۔ نظریے کی کھپت کسی نہ کسی حد تک افسانے ہی میں ممکن ہے۔ اس کا بہترین نمونہ ترقی پسند افسانے ہیں۔ جدید افسانوں نے رجحان کی کھپت کے نمونے بھی پیش کیے ہیں۔ جدیدیت کے بعد کا سفر بڑا دلچسپ ہے۔ صارفیت، مابعد جدیدیت، دلت احساس، جڑوں کی تلاش، گلوبلائزیشن، عالمی گاؤں کا واہمہ، کثرت میں وحدت کی جگہ پر تکثیریت کو غالب کرنے کی کوشش، حق و باطل کی حد بندی کا اس حد تک ٹوٹنا کہ آج کے حُسین کو آج کے یزید سے مکالمے کی ضرورت محسوس ہونے لگے، کائنات کے پیاز کا چھلکا ہونے کی بات، مصنف اور متن کی وقعت کم ہو جانا اور قاری کی وقعت کا بڑھ جانا، کسی ایک نظریے کی جگہ مرکب نظریوں کا سامنے آنا، ادب برائے زندگی، ادب برائے بندگی، ادب برائے ادب، وغیرہ مختلف نظریات و رجحانات کا ایک انبار سا لگا ہوا ہے۔ میں ذاتی طور پر نظریوں کے اس میلے کا ایک تماشائی ہوں، ان میں سے کوئی مجھے متاثر نہیں کر سکا۔

سوال: بازار میں نیم ادبی اور سستے ناولوں اور ڈائجسٹوں کی فروخت اور ٹی۔وی۔ پر مختلف چینلوں کے ذریعے سیریلوں سے لوگوں کا ذوق پست ہوتا جا رہا ہے اور اب سنجیدہ ادب پڑھنے والوں کی تعداد کم سے کم ہوتی جا رہی ہے۔ ایسے میں آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟

جواب: یہ مسئلہ اتنا سیدھا سادا نہیں ہے جتنا محسوس ہو رہا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس عہد میں ہمارے سماج کا جو کریمی لیئر (Creamy layer) ہے وہ سائنس، مینجمنٹ اور کمپیوٹر کی طرف دوڑ رہا ہے، اس کے بعد جو اوسط درجے کی صلاحیتیں ہیں وہ سوشل سائنس کی طرف جا رہی ہیں۔ زبان و ادب خواہ اردو ہو، ہندی ہو، انگریزی ہو یا کسی اور زبان کا ادب ہو اس کی طرف وہ لوگ متوجہ ہیں جو کچھ اور نہیں کر پا رہے ہیں (الّا ماشاء اللہ)۔ میڈیا میں بھی جو لوگ جا رہے ہیں وہ سوشل سائنس اور آرٹس سے جڑے ہوئے لوگ جا رہے ہیں گویا وہاں بھی اوسط اور اوسط درجے سے بھی کم صلاحیتیں میدان سنبھالے ہوئی ہیں۔ ایسے میں معیار پر منفی اثر کا پڑنا لازمی ہے۔ اسے ہم آپ چاہ کر بھی نہیں روک سکتے۔ اس کی ایک اور بڑی وجہ یہ ہے کہ ترقی پسند، تعمیر پسند اور مابعد جدید ان تینوں نے ادب کو ذریعہ سمجھا ہے مقصد نہیں۔ ہر گروپ ادب سے کوئی نہ کوئی فائدہ لے رہا ہے۔ ادب کے خود مکتفی اکائی (Independent Unit) ہونے کی بات کرنے والوں کو جدیدیے جدیدیے کہہ کر مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے جب ادب کے ذریعے سماجی مساوات لائی جائے گی، مزدوروں، کسانوں اور غریبوں کی لڑائی لڑی جائے گی تو پھر ایسے میں تو ادب کی حیثیت خود بخود ثانوی ہو جائے گی اور ادب کے ذریعے جو مقصد حاصل کرنا ہے اس کی حیثیت اول ہو جائے گی۔ کل ترقی پسند اور جماعتِ اسلامی والے بھی یہی کر رہے تھے، آج میڈیا والے بھی یہی کر رہے ہیں۔ جب کل لوگوں کی واہ واہ کی گئی تو آج میڈیا والوں پر آہ آہ کیوں؟ جس کرنی تس بھوگ۔

سوال: آپ افسانہ لکھنے کے لیے کسی مخصوص تکنیک اور اسلوب کا تعین پہلے کرلیتے ہیں یا لکھتے ہوئے منفرد اسلوب خود بخود وجود میں آجاتا ہے؟

جواب: اسلوب اور تکنیک وغیرہ عام طور سے خود بخود سامنے آتی ہے بشرطیکہ افسانہ ہی طاقتور ہو اور اگر افسانہ کمزور رہتا ہے تو میرے اندر کا ناقد اس پر چڑھ بیٹھتا ہے اور اسلوب و تکنیک کی بنوٹ بھانجنے لگتا ہے۔

سوال: ملک میں اردو کی جو صورتِ حال ہے اس سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

جواب: اس لحاظ سے صورتِ حال اطمینان بخش ہے کہ کشمیر میں اردو سرکاری زبان ہے۔ بہار، یوپی اور دہلی وغیرہ میں اردو دوسری سرکاری زبان ہے۔ مہاراشٹر اور حیدرآباد میں اردو کے علاقے مضبوط اور وسیع ہوتے جا رہے ہیں۔ سرکاری سطح پر بھی اردو کے فروغ و بقا کے لیے بطور خاص قومی اردو کونسل کے پلیٹ فارم سے اور عمومی طور پر متعدد طریقوں سے حتی الامکان ہمت افزائی کی جا رہی ہے مگر دوسری طرف غیر مطمئن ہونے کی وجوہات بھی بہت سی ہیں مثلاً نصابی کتابوں کا اردو میں حاصل نہ ہونا، انٹرمیڈیٹ کی سطح پر اردو کی تعلیم کو انگریزی کے متبادل کے طور پر جاری کرنے کی وجہ سے اردو تعلیم کے چلن کا کم ہونا، عوامی سطح پر ہندی کے قومی زبان ہونے کی خبر کو زور شور سے مشتہر کرنا اور اردو سمیت دیگر چودہ زبانوں کو ان کے قومی زبان ہونے کے باوجود انھی طاقتوں میں قید کرنا، خود مسلمانوں کا اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان سمجھنا اور اس کے باوجود صرف سرکار کی غلطی اور کمی پر نگاہ رکھنا اور اپنی غلطی اور کمی کو بھول جانا، یہ کچھ ایسے مسائل ہیں جو اردو کے مستقبل کے بارے میں تشویش پیدا کرتے

ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب تک جڑوں میں پانی نہیں پہنچایا جائے گا اور اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان سمجھ کر اس کے خلاف پھیلی اور پھیلائی ہوئی نفرت کی فضا کو کم نہیں کیا جائے گا، اردو کی صورتِ حال کم از کم ہندستان میں تشویشناک بنی رہے گی۔

سوال: بہار میں فکشن لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد ہے۔ آپ ان کے فکشن سے کس حد تک مطمئن ہیں؟

جواب: میں اپنے ہم عصروں اور دوستوں عبدالصمد، شموئل احمد، شفق، علی امام، شوکت حیات، انیس رفیع، رضوان احمد، پیغام آفاقی، غضنفر وغیرہ سے مطمئن ہوں۔ صفیر رحمانی، مشرف عالم ذوقی، احمد صغیر وغیرہ سے پُر امید ہوں۔

سوال: بہار میں اردو دوسری زبان ہے، پھر بھی اردو کی فروغ کے لیے سرکاری کوششیں صفر کے برابر ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: اس میں سراسر غلطی ہم اردو والوں کی ہے۔ سب سے بڑا المیہ تو یہ ہے کہ اکثر حضرات اردو کے اساتذہ کو اردو کی بدحالی کا ذمے دار سمجھتے ہیں اور ایک عام محاورہ آج کل بہت سننے میں آتا ہے کہ یہ اردو کی روٹی کھانے والے اردو کی خدمت نہیں کر رہے ہیں۔ یہ کھلا جھوٹ ہے۔ اردو کا پروفیسر اور ٹیچر اردو کی روٹی نہیں کھا رہا ہے، اردو اساتذہ کی وجہ سے اردو کا چراغ جل رہا ہے۔ اردو اساتذہ چاہے وہ یونیورسٹی کالج میں ہوں یا پرائمری اسکول میں، ان کی بنیادی ذمے داری یونیورسٹی اور اسکول تک ہے۔ پوری اردو آبادی میں اردو کے حق میں فضا عام کرنا اور اردو کے خلاف کی جانے والی حرکات کے سدِ باب کی کوشش کرنا ان کا فریضہ ہے جو اردو انجمنوں سے جڑے ہیں، جو سرکاری سطح پر اردو کے نام پر بہت سی مراعات حاصل کر رہے ہیں۔ یہ اصولی بات ہوئی۔ اخلاقی طور پر اردو اساتذہ کو اپنی ذمے داریوں سے ضرور آگاہ ہونا چاہیے اور ان ذمے داریوں کو پورا کرنے کی حتی الامکان کوشش کرنی چاہیے۔ یہ ان کے اور اردو کے حق میں دونوں کے لیے بہتر ہوگا۔

سوال: قومی اردو کونسل نے اردو داں طبقے کو نئے ابھرتے ہوئے ٹیکنالوجیکل منظرنامے سے جوڑنے کی کوشش کی ہے اور کررہی ہے۔ اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: ظاہر ہے کہ جس تیز رفتاری کے ساتھ دنیا کمپیوٹرائیزیشن کی طرف بڑھ رہی ہے اس میں اس کی ضرورت و اہمیت سے انکار ناممکن ہے مگر اس ساری پیش رفت پر سب سے خوب صورت تبصرہ گلزار نے اپنی نظم ''کتاب'' میں کیا ہے، میں اس سے حرف بحرف متفق ہوں۔ قومی اردو کونسل کو بہرحال کمپیوٹر بمقابلہ کتاب میں کتاب کی طرف کھڑے رہنا چاہیے۔

سوال: فروغ اردو کے لیے قومی اردو کونسل کئی اسکیمیں مثلاً کتاب میلہ، موبائل وین، مصنفین کی مالی امداد اور بلک پرچیز وغیرہ چلا رہی ہے۔ ان کوششوں سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

جواب: یہ تمام کوششیں اردو کے فروغ میں یقیناً معاون ثابت ہورہی ہیں لیکن ان کے ساتھ ساتھ اردو زبان کو عوامی سطح تک پہنچانے کی غرض سے ایسے لیڈر بھی تیار کرنے کی ضرورت ہے جو ہمہ وقتی طور پر اردو کا کام کرسکیں۔ یہ کام قومی کونسل چاہے تو کرسکتی ہے، اس کے پاس ذرائع بھی ہیں۔

سوال: اردو تعلیم کو بہتر بنانے اور اسے فروغ دینے کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟

جواب: (1) پرائمری سطح پر پرائمری اور مڈل اسکولوں کی ڈسپلن، بچوں کا لباس، حاضری، ریزلٹ اور اسکولوں کے Mentainance پر بطور Insentive اساتذہ اور طلبہ کو انعام سے نوازا جائے۔ (2) ہائی اسکولوں میں قومی کونسل یا انجمن ترقی اردو کی طرف سے وقت وقت ایسے آبزرورس بھیجے جائیں جو خاموشی کے ساتھ معائنہ کرکے اپنی رپورٹ حکومت کو بھیجیں اور حکومت اس رپورٹ پر کارروائی کرے۔ (3) سیکنڈری سطح پر جس طرح One to ten کو انعام دیا جاتا ہے اسی طرح جس علاقے میں جو زبانیں پڑھائی جارہی ہیں ان زبانوں میں سب سے زیادہ نمبر لانے پر ایک دو انعام دیا جائے۔ (4) زبان کے امتحان میں اچھے ریزلٹ کی بنیاد پر اس اسکول کے اس زبان کے اساتذہ کو کچھ انعامات دینے یا سرکاری سطح پر دلانے کی کوشش کی جائے۔ (5) انٹرمیڈیٹ کی سطح پر جو طالب علم مادری زبان پڑھنا چاہے اسے اس کا موقع دیا جائے اور مادری زبان کو کسی اور دوسری زبان کے ساتھ Optional نہ بنایا جائے۔ (6) آنرز کی سطح پر ہر کالج میں (الف) اردو زبان کے اساتذہ کی کمی پوری کی جائے۔ (ب) نصاب کی کتابیں اردو میں مہیا کرائی جائیں۔ (ج) اسکرپٹ آکزامز کا پرانا طریقہ بحال کیا جائے۔ (7) پوسٹ گریجویٹ کی تعلیم ہر یونیورسٹی کے ہیڈکوارٹر میں محدود کی جائے۔ (8) ایسی صورتِ حال پیدا کی جائے کہ پرائمری سے یونیورسٹی سطح تک طالب علم حاضری کے بغیر Sentup نہ کرسکے۔ (9) امتحانات میں نقل روکی جائے۔ (10) کاپی جانچنے کے مرحلے میں پیروی کا کاروبار بند کیا جائے۔

سوال: کیا ہندستان کا موجودہ منظرنامہ اردو ذریعۂ تعلیم کے حق میں ہے؟

جواب: اس کے بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اسے وقت پر چھوڑیے۔

سوال: ''اردو دنیا'' کے قارئین کو آپ کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

جواب: بغیر پڑھے سوچیے مت، بغیر سوچے پڑھیے مت، فکر اور علم کے بغیر زندہ مت رہیے۔ □□□

P.G. Deptt. of Urdu, Patna University, Patna-800005

رشید حسن خاں

"زبان اور قواعد" سے اقتباس

لغت اور استعمالِ عام

بنفشہ: نور میں اس کو "بہ فتحِ بادنون وشین" لکھا ہے، اردو میں اِسی طرح بولتے ہیں، مگر مولف نے اس تلفظ کو فارسی سے بھی متعلق بتایا ہے۔ یہ درست نہیں۔ فارسی میں بہ فتحِ اوّل وضمِ نون اور بہ ضمتین ہے۔ آصفیہ میں "بُنَفشَہ" لکھا ہوا ہے، مگر اُس میں بھی یہ وضاحت نہیں کہ یہ اردو کا تصرّف ہے۔ اس سے غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے۔ فارسی میں جو بھی صورت ہو، اردو میں یہ صرف بہ فتحِ اوّل و دوم و چہارم مستعمل ہے، اور اردو کی حد تک اسی کو صحیح ماننا چاہیے۔

بہادر: لغات میں اس کو بہ ضمِ دال لکھا گیا ہے۔ یہ لفظ اِس طرح بھی مستعمل ہے اور اِس کا ایک تلفظ بہ فتحِ دال بھی ہے۔ اِس تلفظ کو بھی تسلیم کرلینا چاہیے۔ یہ اردو کا تصرّف ہوگا۔

بہزاد: بہ لحاظ اصل یہ لفظ بہ کسرِ اوّل ہے (بِہزاد) مگر اردو میں زبانوں پر عموماً بہ فتحِ اوّل ہے، اور اردو کے لحاظ سے یہی فصیح معلوم ہوتا ہے۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔ نور میں ہے اور اُس میں اصل کے مطابق بہ کسرِ اوّل ہی لکھا گیا ہے۔

بہشت: نور میں اس کو بہ کسرتین لکھا گیا ہے، مگر اردو میں بہ کسرِ اوّل و دوم کوئی نہیں بولتا۔ اردو میں اِس لفظ کو بہ فتحِ اوّل وکسرِ دوم صحیح سمجھنا چاہیے۔

بیاباں: فارسی میں حرفِ اوّل کو مفتوح بھی بتایا گیا ہے اور مکسور بھی۔ اردو میں یہ عموماً زبانوں پر بہ کسرِ اوّل ہے، نور میں اِس لفظ کے اعراب کا ذکر نہیں کیا گیا۔ دونوں حرکات قابلِ تسلیم ہیں (بِیاباں، بَیاباں)

پروردگار: اصل کے لحاظ سے دال موقوف ہے، نوراللغات میں بھی اِسی طرح ملتا ہے؛ مگر گفتگو میں دال مکسور ہوجاتا ہے۔ اگر اصل کے مطابق کوشش کرکے دال کو موقوف رکھا جائے اور "پَر وَردگار" کہا جائے تو گفتگو کی روانی پر اچانک حرف آجائے گا۔ یہ صورت اِس لفظ سے خاص ہے۔ جیسے ایک اور لفظ ہے "خداوندگار"، اُس کی یہ صورت نہیں، اُس میں دال موقوف ہی ہے۔

پریشان: فارسی میں حرفِ اوّل مکسور بھی ہے اور مفتوح بھی، اِسی رعایت سے مولفِ نور نے اِس کو دونوں طرح لکھا ہے، اور اُن کی تحریر سے یہ متبادر ہوتا ہے کہ فارسی کی طرح اردو میں بھی حرفِ اوّل مکسور اور مفتوح ہے۔ مگر یہ ٹھیک نہیں۔ اُردو میں یہ صرف بہ فتحِ اوّل مستعمل ہے۔ بہ کسرِ اوّل کو فارسی سے متعلق قرار دینا چاہیے۔

پژمردہ: فارسی میں حرفِ اوّل مکسور بھی ہے اور مفتوح بھی۔ اردو میں یہ صرف بہ فتحِ اوّل مستعمل ہے۔

پنجرہ: آصفیہ میں اِس کو "پِنجرہ" لکھا گیا ہے، یعنی نون ساکن اور جیم موقوف۔ اس کے برخلاف نور میں "پَنجَرہ" ہے، یعنی جیم مفتوح۔ مولف نے قوسین میں یہ بھی لکھا ہے: "اردو میں بہ سکونِ جیم بھی مستعمل ہے۔" اس اندازِ نگارش سے مترشح ہوتا ہے کہ مولف کی رائے میں اردو میں یہ لفظ دونوں طرح مستعمل ہے۔ بہ حرکتِ جیم کی سند میں منیر کا یہ شعر لکھا گیا ہے۔

جوشِ جنوں ہمیشہ ہے دل ہائے چاک میں
شیروں سے خالی ایک گھڑی پنجرے نہیں

مگر استعمالِ عام میں یہ لفظ صرف بہ جیمِ موقوف آتا ہے۔ بہ حرکتِ جیم کو ازقسمِ شاذ اور اب متروک سمجھنا چاہیے، اور اس کی صراحت کی جانی چاہیے۔

پوچ: فارسی میں واو معروف ہے۔ اسی رعایت سے نور میں بھی واو پر معروف ہونے کی علامت ملتی ہے (پُوچ)۔ بول چال میں عام طور پر یہ بہ واو مجہول سننے میں آتا ہے، یہ واو معروف شاید ہی کوئی بولتا ہو۔ اردو میں بہ واو مجہول کو مرجح قرار دینا چاہیے۔ آصفیہ میں معروف ومجہول کی صراحت نہیں ملتی۔

تشنہ: آصفیہ میں "تِشنہ" اور "تِشنگی" کی "ت" پر زیر لگا ہوا ہے۔ اِس کے برخلاف نور میں اِس کو بہ فتحِ اوّل لکھا گیا ہے اور بہ کسرِ اوّل کو غلط بتایا گیا ہے: "بہ فتح تا صحیح ہے، بہ کسرِ تا غلط۔" فارسی میں جو بھی صورت ہو، اردو میں زبانوں پر یہ دونوں لفظ عموماً بہ کسرِ اوّل ہیں، اور یہی تلفظ مرجح ہے۔ ان لفظوں کی دونوں حرکات کو درجِ لغت ہونا چاہیے، مگر اس صراحت کے ساتھ کہ اردو میں مستعمل بہ کسرِ اوّل ہیں، اور یہ اردو کا تصرّف ہے اور صحیح دونوں طرح ہیں۔

تغلق: غیاث اللغات میں اِس کو بہ ضمِ اوّل وسوم (تُغلُق) لکھا گیا ہے اور صراحت کردی گئی ہے کہ "از لُغاتِ ترکی نوشتہ شد۔" اردو میں یہ لفظ بہ ضمِ اوّل وفتحِ سوم (تُغلَق) مستعمل ہے، اور اردو کے لیے اس کی یہی صورت صحیح مانی جائے گی۔ آصفیہ ونور میں یہ لفظ موجود نہیں۔

تلمیذ: صاحبِ نوراللغات نے لکھا ہے: "تلمیذ ع۔ یہ لفظ عربی میں بالفتح، فارسی میں بالکسر ہے۔" یہ برعکس بات ہے۔ یہ لفظ عربی میں بہ کسرِ اوّل ہے (المنجد) یہ صراحت بھی کردی گئی ہے کہ شاید یہ فارسی کے لفظ "تلمیذ" بہ فتحِ اوّل کی تعریب ہے: "تلمیذ بالکسر، شاگرد، تلامذہ جمع۔ وظاہرا فارسی است، و عربی فصیح نیست، ولہٰذا صاحبِ قاموس نیاوردہ، امّا تحقیق آن است کہ معرّب تلمیذ است بالفتح" (منتخب اللغات)۔ مطلب یہ ہوا کہ فاسی میں بہ فتحِ اوّل ہے اور عربی میں بہ کسرِ اوّل۔ اردو میں صرف بہ فتحِ اوّل مستعمل ہے۔ بہ کسرِ اوّل کو عربی سے متعلق سمجھنا چاہیے۔

تیمور: آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔ نور میں اِس کو اصل کے مطابق بروزنِ "ذی نور" لکھا گیا ہے، مگر اردو میں عموماً زبانوں پر بہ فتحِ اوّل ہے اور

کبھی کبھار بہ کسرِ اوّل دیا ہے مجہول بھی سننے میں آجاتا ہے۔

جبروت: اصلاً بہ فتحِ اوّل و دوم ہے اردو میں یہ بہ سکونِ دوم بھی مستعمل ہے، اور یہ اردو کا تصرّف ہے۔ اس لفظ کی دونوں صورتیں تسلیم کر لینا چاہیے۔ فرہنگِ آصفیہ اور نور اللغات میں یہ لفظ اصل کے مطابق صرف بہ فتحِ اوّل و دوم ہے۔

جدّہ: عربی میں بہ فتحِ اوّل و دالِ مشدّد و مفتوح کے معنی ہیں: مادرِ مادر و مادرِ پدر (منتخب اللغات)۔ اور معروف بندرگاہ کے معنی میں بہ کسرِ اوّل اور بہ ضمِ اوّل دونوں طرح ہے (غیاث اللغات)۔ اردو میں ان دونوں معانی میں یہ لفظ صرف بہ فتحِ اوّل و دالِ مشدّد و مفتوح مستعمل ہے اور اردو میں اسی طرح صحیح مانا جائے گا۔

جرح: اردو میں یہ لفظ بہ کسرِ اوّل و فتحِ دوم بھی بول چال میں آتا ہے، اور اس کی یہ صورت بھی قابلِ تسلیم ہے۔ آصفیہ کے اندراج سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ''قانونی معنی میں بالفتح پڑھنا چاہیے۔'' یعنی مولف کے نزدیک اس کی صرف دو صورتیں ہیں: جُرح، جَرح۔ مگر ''جُرح'' (بہ ضمِ اوّل و سکونِ دوم) تو اردو میں مطلقاً مستعمل نہیں۔ اس کو عربی سے مخصوص سمجھنا چاہیے۔ ترکیب کی صورت میں عموماً یہ بہ سکونِ دوم آتا ہے، جیسے: جرح و تعدیل۔ ''ج'' کو عموماً زیر کے ساتھ ہی بولا جاتا ہے، ممکن ہے کہ کچھ لوگ بہ صورتِ ترکیب اس کو بہ فتحِ اوّل بھی بولتے ہوں، مگر مفرد لفظ ''جرح'' بہ کسرِ اوّل و فتحِ دوم ہی گفتگو میں آتا ہے۔ ''جرح کرنا'' میں بھی اس لفظ کی یہی صورت رہتی ہے۔

جسارت: اصلاً بہ فتحِ اوّل ہے۔ بول چال میں یہ بہ کسرِ اوّل بھی آتا ہے۔ اس لفظ کی دونوں حرکات مان لینا چاہیے۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔ نور میں ہے اور صرف بہ فتحِ اوّل۔

جفر: (ایک علم کا نام) اصلاً بہ سکونِ دوم ہے۔ اردو میں بہ فتحِ اوّل و دوم مستعمل ہے، اور اردو کے لحاظ سے یہ مرخّم ہے۔ چوں کہ نظم میں یہ اصل کے مطابق بہ سکونِ دوم استعمال کیا گیا ہے، اس لیے اس لفظ کو دونوں طرح صحیح ماننا چاہیے، مگر اس صراحت کے ساتھ کہ اردو میں اب مستعمل بہ فتحتین ہے۔

جمع: اصلاً یہ لفظ بہ سکونِ دوم ہے۔ اس طرح استعمال میں بھی آتا ہے۔ ترکیبوں میں تو صرف اسی طرح استعمال کیا جاتا ہے اور اسی طرح استعمال بھی کرنا چاہیے، البتہ گفتگو میں عام طور پر یہ بہ فتحِ دوم آتا ہے، جیسے: بہت مال جمع ہو گیا ہے۔ اس صراحت کے ساتھ اس لفظ کو بہ فتحِ دوم بھی درست مان لینا چاہیے، اور یہ اردو کا تصرّف ہوگا۔ تراکیب میں یہ بہ دستور بہ سکونِ دوم رہے گا۔ (توصیفی، اضافی، عطفی، کوئی سی بھی ترکیب ہو)۔

جنازہ: عربی میں حرفِ اوّل مکسور بھی ہے اور مفتوح بھی (منتخب اللغات)۔ اردو میں صرف بہ فتحِ اوّل مستعمل ہے۔

جنوب: اصل میں ''ج'' پر زبر ہے۔ اردو میں بہ ضمِ دوم استعمال ہوتا ہے اور اب یہی مرخّم صورت ہے۔ لغت میں دونوں حرکات کا اندراج ہونا چاہیے، مگر صراحت کے ساتھ۔

چراغ: فارسی میں حرفِ اوّل کو مفتوح بھی کہا گیا ہے اور مکسور بھی (غیاث اللغات)۔ اردو میں بھی یہ دونوں طرح سننے میں آتا ہے، مگر بہ فتحِ اوّل کم اور بہ کسرِ اوّل زیادہ۔ ''چراغی'' تو بہ کسرِ اوّل ہی بولا جاتا ہے۔ ''چراغاں'' دونوں طرح سننے میں آیا ہے۔ اردو میں دونوں صورتوں کو صحیح ماننا چاہیے مگر مندرجۂ بالا صراحت کے ساتھ۔ آصفیہ میں ''چَراغ'' لکھا ہوا ہے، اور بہ کسرِ اوّل کے متعلق کچھ وضاحت نہیں کی گئی۔ نور میں فارسی کے اختلاف کا تو ذکر کیا گیا ہے، مگر یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ اُردو میں کیا صورت ہے۔

چکن: اردو میں یہ لفظ صرف بہ کسرِ اوّل و فتحِ دوم مستعمل ہے، اور اردو میں اب اسی طرح صحیح اور فصیح ہے۔ آصفیہ میں ''چکّن'' لکھا گیا ہے مگر توسین میں یہ بھی لکھا ہوا ہے: ''صحیح یہ کسر تین۔'' اس اندراج سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ اردو میں بھی صحیح بہ کسرِ اوّل و دوم ہے مگر یہ صحیح نہیں ہوگا اور مولف کا بھی یہ مطلب نہیں۔ بہ کسر تین کو فارسی سے مخصوص سمجھنا چاہیے۔ نور میں اس کی اصل حرکات ''بہ فتحِ اوّل و کسرِ دوم'' بتائی گئی ہیں، مگر یہ اندراج صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اصلاً یہ بہ کسرِ اوّل و دوم ہے اور اردو میں یہ صرف بہ کسرِ اوّل و فتحِ دوم ہے۔

حجم: اصلاً یہ لفظ بہ سکونِ دوم صحیح ہے۔ اردو کی بول چال میں یہ اکثر بہ فتحِ دوم آتا ہے۔ اس لفظ کو دونوں طرح صحیح مان لینا چاہیے۔ آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔ نور میں صرف بہ سکونِ دوم ہے۔

حلق: بہ لحاظِ لغت بہ فتحِ اوّل و سکونِ دوم ہے، مگر زبانوں پر بہ فتحِ اوّل و دوم بھی ہے۔ دونوں طرح مان لینا چاہیے۔ ترکیب کی صورت میں اصل کے مطابق بہ سکونِ دوم ہی آتا ہے۔

حلقوم: لغت میں ''ح'' پر پیش ہے، مگر استعمالِ عام میں بہ فتحِ اوّل ہے۔

حلیہ: خلعت اور صورت و خلقت کے معنی میں اصلاً بہ کسرِ اوّل ہے اور سونے چاندی (وغیرہ) کے زیور کے معنی میں بہ کسرِ اوّل و بہ ضمِ اوّل دونوں طرح ہے (منتخب اللغات)۔ اردو میں یہ لفظ صورت، چہرہ، خط و خال (جو شناخت کے لیے لکھے جائیں) کے معانی میں بہ ضمِ اوّل استعمال ہوتا ہے، اور اب یہی حرکت قابلِ قبول ہے۔

حوصلہ: لغت میں اس کو بہ فتحِ اوّل و سوم و چہارم لکھا گیا ہے۔ نور و آصفیہ میں بھی یہی صورت ملتی ہے۔ بول چال میں بہ سکونِ سوم آتا ہے اور عموماً اسی طرح مستعمل ہے، اور یہی صورت مرخّم ہے۔

خانقاہ: نور میں بہ فتحِ نون اور بہ سکونِ نون دونوں طرح لکھا گیا ہے۔ اردو میں صرف بہ سکونِ نون مستعمل ہے اور صرف یہی صورت قابلِ قبول ہے۔

خلوص: اصلاً بہ فتحِ واو ہے زبانوں پر بہ کسرِ واو ہے، اور یہی صورت مرخّم ہے۔ نور میں لکھا ہوا ہے کہ ''اُردو میں بہ کسرِ واو زبانوں پر ہے۔'' (جاری)

حکیم سید محمد حسان نگرامی

(تاریخ طب سے اقتباس)

یونانی اور آیورویدک طب کے بنیادی نظریات

ایلیڈ اور اوڈیسی جیسے قدیم فن پاروں سے پتہ چلتا ہے کہ یونانیوں کے نزدیک مرض اور موت خدا کی طرف سے بندوں پر مسلّط کی جاتی تھی۔ خدا کی ناراضگی اور بندوں کی بداعمالیاں مرض کے وقوع کا سبب سمجھی جاتی تھیں۔ ان کے علاج کے لیے بنیادی طور سے قربانیوں، دعاؤں، نمازوں اور مخصوص خداؤں کے ذریعہ دعائیں مانگی جاتی تھیں، گویا قدیم یونانی طب بھی مذہبی اثرات سے وابستہ تھی۔

مختلف امراض کے لیے یونانی طب میں الگ الگ خداؤں کا تصور رائج تھا۔

- ''اپولو'' متعدی امراض اور موت کا ذمہ دار سمجھا جاتا تھا۔
- ''اریمس'' عورتوں میں دماغی اعصابی امراض اور موت واقع کرتا تھا۔
- ''چوتھونائی'' جنون اور مرگی جیسے امراض کا سبب سمجھا جاتا تھا۔

اس طرح الگ الگ بیماریاں الگ الگ خداؤں سے وابستہ سمجھی جاتی تھیں۔

اصولِ علاج و علاج:

ابتدائی دور کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ مریض کو مندر میں لٹا دیتے تھے، پھر اسے خواب نظر آتے تھے اور خواب میں اسے علاج کا طریقہ بتا دیا جاتا تھا— یونانی اصولِ علاج کو جینی نے دو طریقوں میں تقسیم کیا ہے:

1- براہ راست طریقہ۔

2- بالواسطہ طریقہ۔

علاج کا بالواسطہ طریقہ:

اس طریقے میں مریض کے ہاتھ اوپر کر کے لٹا دیتے تھے اور پھر یہ تصور تھا کہ خدایانِ صحت باری باری مریض میں حلول کر کے مرض کا علاج کر دیں گے۔

اس سلسلے میں طبیب اوّل اسقلی بوس اور اس کے قریبی ساتھیوں کے سہارے یہ عمل زیادہ آسانی سے پورا کیا جاتا تھا۔

ہاتھ پھیلاتے وقت داہنا ہاتھ ہی استعمال ہوتا تھا، بایاں ہاتھ اس مقصد کے لیے بالکل استعمال نہیں ہوتا تھا۔

ہاتھ پھیلانے کا طریقہ یہ تھا کہ انگوٹھا، کلمۂ شہادت اور درمیانی انگلیاں کھلی رہتی تھیں جبکہ اور دوسری انگلیاں ہتھیلی سے ملی رہتی تھیں۔

علاج کا براہ راست طریقہ:

اس طریقے میں مریض اور خدا کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہوتا تھا بلکہ مریض کسی جگہ لیٹ جاتا تھا، وہاں اسے خواب میں دواؤں کی تفصیل معلوم ہوتی اور اسے وہ مختلف منتروں اور دعاؤں کے ساتھ استعمال کرتا تھا۔ اگرچہ کتابوں میں دواؤں کے نام تو نہیں ملتے لیکن جڑیوں مرہموں کی اصطلاحات ضرور ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے چشموں اور کنوئیں کا پانی مقدس اور صحت بخش سمجھا جاتا تھا۔

یونانی طب میں صحت کے قدیم دیوتا:

یوں تو صحت کے دیوتاؤں کی ایک لمبی فہرست کتابوں میں درج ہے تاہم رب الصحت اسقلی جسے عام طور سے طب کا موجد سمجھا جاتا ہے اتنی شہرت کسی کو حاصل نہیں ہوئی۔ ابوالطب بقراط کو اسی خاندان کا فرد سمجھا جاتا ہے۔

اسقلی بوس کے علاوہ درج ذیل خدایانِ صحت کے نام بھی ملتے ہیں۔

(1)- مغراؤس (2)-افردویس (3)- اپولو (4)- ارستیاؤس (5)- ارطمیس (6)- اتھینا۔ (7)- آکسیا (8)- دامیا (9)- دیمیطر (10)- ایلاطیا(11)- ایقاؤس (12)- جطیلس (13)- حارث (14)- ہنگائی۔ (15)- ہیلوس (16)- ہتھیسا سطوس (17)- ہیرا (18)- ہراکلوس (19)- ہرمس (20)- ہائی جیا (21)- آئی سس (22)- لیجو (23)- میلاطیس (24)- موسں (25)- نیمفس (26)- آرفوسس (27)- فرسفون (28)- فوسیدون (29)- سباذیوس (30)- زیوس (31)- سرامنیس (32)- طمیس۔

آیورویدک کی مختصر تاریخ:

آیورویدک طب کو ہمارے ہندو بھائی الہامی مانتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس کی ابتدا برہماجی سے ہوئی، کتابوں میں اس کی ترویج و اشاعت کے بارے میں مذکور ہے کہ برہماجی سے دکھش پرجاپتی نے اس علم کو سیکھا اور دکھش پرجاپتی سے اشونی کماروں نے یہ علم حاصل کیا اور ان سے مہاراجہ اندر نے سیکھا۔

برہما سے اندر تک چاروں بزرگ طب اور جراحی دونوں علوم سیکھتے رہے بعد میں اندر نے دونوں شاخوں کو الگ الگ رشیوں کو سکھانا شروع کیا۔ چنانچہ

انھوں نے بھگوان دیوداس دھنونتری والیِ کاشی کو فنِ جراحی کی تعلیم دی، جن کے شاگرد رشی سشرت کا نام تاریخ کے صفحات میں آج بھی روشن ہے اور علمِ طب زاہد کامل مہارشی بھردواج کو پڑھائی جو بہت سے رشیوں کی تحریک پر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ اس سلسلے میں قصہ یوں مشہور ہے کہ دنیا میں امراض کے بڑھ جانے کی وجہ سے لوگوں کی عبادت اور تعلیم وتعلم میں خلل پڑنے لگا تھا اس لیے ان رشیوں نے کوہِ ہمالہ کے دامن میں ایک دلکش مقام پر جمع ہوکر باقاعدہ طور پر بھردواج کو اپنا نمائندہ بنا کر اندر کے پاس طب کے لیے بھیجا تھا۔ چنانچہ جب مہارشی بھردواج وہاں سے فارغ ہوکر آئے تو سب کو اپنا اپدیش سنایا۔ ان کے اہم شاگرد آتری تھے جنھوں نے اپنے شاگرد اگنی ویش، بھیل، جتوکرن، پراشتر، ہاریت اور کھشارانی یادگار چھوڑے۔

حکیم غلام جیلانی نے ایک دوسری روایت کے حوالے سے لکھا ہے کہ مہاراجہ اندر نے سورگ میں بیٹھے ہوئے ایک دفعہ اس دنیا پر نظر ڈالی اور دیکھا کہ دنیا میں بہت سے لوگ دکھ درد میں مبتلا ہیں تو انھوں نے دیوتاؤں کے ربانی وید مہاراج دھن ونتری سے کہا کہ وہ دنیا میں جا کر لوگوں کے دکھ درد اور تکالیف دور کریں۔ چنانچہ انھوں نے مہاراج اندر کی اس فرمائش کی تکمیل کی اور راجا بنارس کے یہاں جنم لے کر دیوداس کے روپ میں نمودار ہوکر اس نیک کام کو انجام دیا۔ ان کی پیدائش کا حال عجیب وغریب ہے۔ اس بنیاد پر اسے طبِ الہامی تصور کیا جاتا ہے۔

آیورویدک کے بنیادی نظریات:

اصولی طور پر طبِ یونانی کی طرح آیورویدک میں ارکان اور اخلاط کا نظریہ موجود ہے البتہ نوعیتِ عمل کے اعتبار سے خطِ امتیاز قائم کیا جاسکتا ہے۔

آیورویدک میں نظریۂ ارکان:

آیورویدک میں سات ارکان کا تصور ملتا ہے۔ پہلے کورس یعنی کیلوس، دوسرے کو رکت یعنی خون، تیسرے کو ماس یعنی لحم، چوتھے کو میدیعنی چربی، پانچویں کو ہاڈ یعنی ہڈی، چھٹے کو مجہ یعنی مغز، ساتویں کو شکر یعنی دھات یا منی کہتے ہیں۔

ان کے نزدیک ارکان کی تفصیل یہ ہے کہ غذا کھانے کے چار پہر دو گھڑی گزرنے کے بعد رس یعنی کیلوس بنتا ہے پھر خون کی پیدائش ہوتی ہے اس کے بعد چار پہر دو گھڑی کے بعد لحم پیدا ہوتا ہے اتنی ہی دیر کے بعد چربی اور اس قدر عرصہ کے بعد چربی سے استخواں پھر استخواں سے مغز اور مغز سے منی پیدا ہوتی ہے۔

آیورویدک نظریۂ اخلاط:

ہندستانی اطبا کے نزدیک اخلاط تین ہیں اوّل پت یعنی صفرا، دوم کف یعنی بلغم، سوم باد جو قریب قریب سودا کے ہے مگر اس کو بجائے خلط کے مرض مانتے ہیں ان تینوں خلطوں کے علاحدہ مزاج بتائے گئے ہیں اور اسی روشنی میں ان تینوں اخلاط کی منفرد علامات کا تذکرہ ملتا ہے۔

آیورویدک نظریۂ تت:

یونانی میں ارکان کے لفظ کو آیورویدمیں تت کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ آیورویدمیں خاک، باد، آب، آتش اور آکاس پانچ تت پائے جاتے ہیں۔ ان تینوں کے الگ الگ مکان کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ چنانچہ خاک کا مقام ہڈی، گوشت اور چربی قرار دیا گیا ہے۔ اور آب کا مکان زبان، عروق، آلات بول، منی اور منی خون ہے۔

آتش کا مکان چشم اور باد کا مکان پوست اور آکاس کا مکان کان کو قرار دیا گیا ہے۔

آیورویدک میں ماہیتِ مرض:

طبِ یونانی کی طرح آیورویدمیں بھی سوءِ مزاج ہی مرض کا سبب ہوتا ہے۔ چنانچہ سوءِ مزاج خلطی اور سوءِ مزاج سادہ دونوں کا تصور پایا جاتا ہے۔ مرضِ مفرد اور مرضِ مرکب کا نظریہ بھی شامل ہے۔ مرضِ مفرد اسے کہتے ہیں جس میں ایک ہی خلط پایا جاتا ہے اور مرضِ مرکب وہ ہے جس میں دو یا دو سے زیادہ خلطوں میں غلبہ موجود ہو۔

اگر پت بات پر غالب آتا ہے تو اسے پت بات کہتے ہیں۔ دوسری بات مع بلغم اسے بات کف یا کفِ بات کہتے ہیں۔ سوم پت مع البلغم اسے پت کف یا کفِ پت کہتے ہیں اس ترکیب کو سودنج کہتے ہیں اور جب ترکیب تینوں خلطوں سے ہوتی ہے تو تردوکھ کہلاتی ہے۔

آیورویدمیں اصولِ علاج:

اصول علاج یہ ہے کہ جب کوئی خلط باؤ سے مل کر شوریدہ ہوجاتی ہے تو اسے منجح استعمال کراتے ہیں۔

منجح کی درج ذیل اقسام کا تذکرہ ملتا ہے۔

گرمیِ آفتاب، آتش کی گرمی، بخار کی گرمی، پانی کی گرمی، لوہا تپنے کی گرمی، حرکت کی گرمی جس میں ضماد، طلا، تدہیر شامل ہیں۔

بہرحال جب کھانے پینے، لگانے سے نفخ پیدا ہوجائے تو دیکھا جائے کہ وہ کس جگہ ہے پھر اس کا اخراج کیا جائے یا جذب کیا جائے۔ اگر موذی فم معدہ میں ہو تو قے کرائیں۔ اگر قعرِ معدہ میں ہے تو مسہل استعمال کرائیں۔ اگر امعاء میں ہو تو حقنہ دیں۔ اگر سر اور حلق میں ہو تو تعزر کریں اور اگر جلد میں ہو تو ضمادات سے کام لیں۔

بطور خلاصہ امراضِ جسمانی کے ازالہ کی درج ذیل شکلیں ہیں۔

پہلا طریقہ سودھن کہلاتا ہے۔

(1) ریچک یعنی مسہل

(2) بستی کرم یعنی حقنہ کرانا۔

(3) بمن کریا یعنی قے کرانا۔

(4) ناس اور سعوط، غرغرہ وغیرہ۔

دوسرا طریقہ سمن کہلاتا ہے اس میں خود مادہ موذی کو مختلف تدابیر سے تحلیل کرتے ہیں۔

آیورویدک میں مضامین کی تقسیم

اردو ترجمہ سشرت میں مہاراجا دھنوتری کے حوالے سے آیورویدک کو درج ذیل شعبوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

1- شلیہ تنتر، اس شعبے میں جراحت کے ذریعے جسم کے اندر بیرونی اشیا یا خراب مادہ کو بذریعۂ آلات خارج کرتے ہیں۔

2- شالاکیہ تنتر، اس شعبے میں گلے کے اوپر، کان، ناک، منہ اور آنکھ وغیرہ کے امراض کا علاج کیا جاتا ہے۔

3- کائے چکتسا، اس شعبے میں عام جسمانی امراض کا علاج ہوتا ہے۔ خاص طور سے بخار، پاگل پن، مرگی اور جذام وغیرہ کا علاج ہوتا ہے۔

4- بھوت ودیا اس شعبے میں دیو، راکشس، ناگ اور جن و آسیب کا علاج ہوتا ہے۔

5- مار بھرت، اس شعبے میں بچہ کی نگہداشت اور ان کے امراض کا علاج ہوتا ہے۔

6- اگد تنتر، اس شعبے میں تمام زہروں اور اس کے تریاق سے متعلق معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔

7- رسائن تنتر، رسائن کو انگریزی میں ٹانک اور یونانی میں اکسیر کہتے ہیں۔ اس شعبے میں مقوی اور محافظِ صحت تدابیر سے بحث کی جاتی ہے۔

8- باجی کرن تنتر، اس میں ضعف باہ، جریان اور دیگر امراضِ تولید کا علاج ہوتا ہے۔

آیورویدک میں امراض کی قسمیں:

آیورویدک میں چار قسم کے امراض کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

آگنتک روگ (امراضِ ظاہریہ)۔ وہ امراض ہیں جو چوٹ، جلنے، کٹنے، آگ، سردی وغیرہ جیسے بیرونی اسباب سے پیدا ہوتے ہیں۔

شاریرک روگ۔ وہ امراض ہیں جو کھانے پینے کی بے اعتدالی اور صفرا، بلغم اور خون وغیرہ کے فاسد ہونے سے ہوتے ہیں۔

سوبھاوک روگ۔ وہ امراض ہیں جو بھوک، پیاس اور بڑھاپے کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔

آیورویدک علاج بالجراحت

آیورویدک طب میں علاج بالدوا اور علاج بالید بیر کے ساتھ علاج بالجراحت کا سلسلہ بھی بے حد قدیم ہے۔ کتابوں میں ملتا ہے کہ جنگ میں زخمی سپاہیوں کی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو اشونی کمار جوڑ دیتے تھے۔ اسی طرح کے اور دوسرے واقعات بھی اشونی کماروں سے منسوب ہیں، چنانچہ آیورویدک میں سشرت کے نام سے جراحت پر ایک جامع کتاب دو ہزار قدیم سے رائج ہے۔ اس کتاب میں تمام جراحتوں کی تدبیریں تفصیل سے درج ہیں اور ان کے آلات بھی باتصویر لکھے گئے ہیں۔ یقیناً آیورویدک طب دوسری طبوں کے مقابلے میں علم الجراحت میں بہت آگے ہے۔ خاص طور سے قدامت کے اعتبار سے تو دوسری طبوں سے بہر حال مقابلہ ہی نہیں کیا جاسکتا۔

□□□

''اردو دنیا'' اور ''فکر و تحقیق'' کے سالانہ خریدار بنیں

''اردو دنیا'' اردو کے حال اور مستقبل کا آئینہ ہے---خود بھی مطالعہ کریں اور اپنے احباب کو بھی اس کے مطالعے کی ترغیب دیں۔

سالانہ قیمت :100 روپے بذریعہ ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک

ماضی کی علمی بازیافت اور حال کی علمی فتوحات سے واقفیت کے لیے **''فکر و تحقیق''** کا مطالعہ کریں۔ سالانہ قیمت:100 روپے

بذریعہ ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک

National Council for Promotion of Urdu Language, New Delhi

کے نام درج ذیل پتے پر روانہ کریں: (دہلی سے باہر کے لوگ -/110 روپے کا چیک بھیجیں)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

کیریئر گائیڈنس

قومی مشترکہ انٹرنس ٹسٹ (NEST)

سلمان عابد

انسانی زندگی میں علم کی اہمیت مسلّم ہے۔ تعلیم بالخصوص پیشہ ورانہ تعلیم ہر شخص کے لیے کامیابی کی کلید ہے۔ ملک میں اس تعلیم کے لیے اچھے برے اعلا اور انتہائی عروج کے حامل تعلیمی ادارے قائم ہیں۔ جہاں آج کا ہر ذہین طالب علم داخلہ حاصل کرکے اپنا کیریئر درخشاں بنانا چاہتا ہے۔ اس پس منظر میں ملک کی مختلف ریاستیں انٹرنس ٹسٹ کا انعقاد کرتی ہیں تاکہ اس کی بنیاد پر بہتر سے بہتر طالب علم کو داخلہ دیا جاسکے۔ مرکزی سطح پر بھی چند قومی مشترکہ انٹرنس ٹسٹ کئی پیشہ ورانہ کورسیز میں داخلے کے لیے تشکیل دیے جاچکے ہیں۔ جیسے مینجمنٹ کورسیز کے لیے CAT اور MAT، انجینئرنگ کے ماسٹرس پروگراموں کے داخلے کے لیے GATE وغیرہ۔ اب ان خطوط پر غور کیا جارہا ہے کہ مختلف پیشہ ورانہ کورسیز کے لیے ایک ہی مشترکہ قومی انٹرنس ٹسٹ منعقد کیا جائے تاکہ اس ٹسٹ کے نتیجے کی بنیاد پر ہندستان کے تمام اہم ترین اداروں کے مختلف پیشہ ورانہ کورسیز میں قابل اور لائق طلبہ کو داخلہ دیا جاسکے اور معیاری تعلیم کے ذریعے معیاری شہری بنائے جاسکیں۔ اس ٹسٹ کو National Education System of Testing (NEST) نام دیا جارہا ہے۔

یہ ٹسٹ مرکزی حکومت کی وزارتِ فروغ انسانی وسائل اور مرکزی وزارتِ سائنس وٹیکنالوجی کی جانب سے منعقد کیا جائے گا۔ جس کا بنیادی مقصد بہتر انسانی وسائل کی معیاری تربیت کے لیے دریافت ہے۔ یہ امتحان آبجیکٹیو طرز کا ہوگا اور نتیجہ نمبرات کے فیصد اور Ranks کی صورت میں سامنے لایا جائے گا۔ اس امتحان کے خدوخال 1986 کی تعلیمی پالیسی کی روشنی میں بنائے گئے ہیں۔ اس امتحان کے انعقاد کی ذمے داری ملک کے IIT's میں سے ہر سال کسی IIT کو دی جائے گی۔ اس ایک امتحان کے نتیجے کی بنیاد پر ملک کے تمام پیشہ ورانہ کورسیز میں طالب علم کو داخلہ ملنے کی سہولت، طلبہ اور ان کے والدین کے لیے سہولت بخش ہوگی۔

ہر سال بارھویں جماعت کے طالب علموں کو بیسیوں انٹرنس امتحانوں سے گزرنا پڑتا ہے اور طالب علم کو ایک ہی ڈسپلن کے لیے مختلف اداروں میں داخلہ امتحانات کی فیس جمع کرنی پڑتی ہے اور الگ الگ تیاری کرنی پڑتی ہے۔ اپنی پسند کے دوسرے ڈسپلن میں بھی داخلے کے لیے انٹرنس امتحانوں کی تیاریاں کرتا اور شریک امتحان ہوتا ہے۔ اس طرح وقت اور پیسے کا اسراف اور ذہنی تشنج طالب علم کے حقیقی کیریئر کے فطری بہاؤ میں مانع ہوتا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے ایک بڑا خدشہ ان کے ذہن میں گردش کرتا رہتا ہے کہ کون سے ٹسٹ کی تاریخ دسترس میں آرہی ہے اور کون سی چھوٹ رہی ہے۔

ان تمام مشکلات کے پس منظر میں ایک ہی قومی مشترکہ انٹرنس ٹسٹ طالب علموں کی کئی پریشانیوں کے لیے اچھا حل ثابت ہوسکے گا۔ اس کے لیے مرکزی وزارتِ فروغ انسانی وسائل نے ایک انقلابی قدم اٹھایا ہے اور NEST کا پروگرام ترتیب دیا ہے۔ اس کے لیے علمی معاملات کے لیے قومی مقتدر ادارے Ed.CIL سے بھی تجاویز وتائیدیں حاصل کی جاچکی ہیں۔

اس ٹسٹ کی ایک اہم خصوصیت یہ رہے گی کہ اس میں طالب علم کی صلاحیت اور استعداد کو Percentile کی بنیادوں پر جانچا جائے گا جو کہ بین الاقوامی اسٹائل ہے جس میں ریک نہیں ہوں گے، البتہ یہ ظاہر کیا جائے گا کہ آپ نے کتنا فیصد بہتر مظاہرہ کیا ہے اور آپ کتنے باصلاحیت ہیں۔ اس سے ہر بڑا اور چھوٹا ادارہ اعلا وکمتر پرسنٹائل پر داخلے کا معیار مقرر کرکے طالب علم کو دعوتِ داخلہ دے گا۔ جس سے کسی بھی طالب علم کو داخلے سے اور تعلیمی سال سے محرومی نہیں ہوگی۔

اس ٹسٹ کی بنیاد پر اندازہ کیا جارہا ہے کہ ملک کے ممتاز، اعلاترین اور عالمی معیار کے تقریباً ڈیڑھ ہزار تعلیمی اداروں میں داخلے کیے جائیں گے جبکہ ان کا اپنا ٹسٹ (JEE) پہلے ہی سے موجود ہے۔

اس ٹسٹ کی تدوین، تشکیل، تعمیل اور ترویج پر IIT's نے مسرت کا اظہار کیا ہے اور سمجھا جارہا ہے کہ امریکہ کے انڈر گریجویٹ کورسیز میں داخلے کے لیے جس طرح SAT روا رکھا گیا ہے اسی طرح NEST کو رواج دیا جائے گا۔ مگر ابھی ٹسٹ کے خدوخال، اور معیار بندی کے امور حتمی شکل اختیار کررہے ہیں۔ امید ہے کہ اس کا نفاذ اگلے تعلیمی سال سے ہوسکے گا۔

حالانکہ گذشتہ سال سے آل انڈیا انجینئرنگ انٹرنس امتحان (AIEEE) قومی سطح پر منعقد کیا جانے لگا ہے تاکہ ملک کے اہم انجینئرنگ اداروں کے B.E./B.Tech کورس میں داخلہ ہوسکے۔ یہ ٹسٹ بڑی کامیابی کے ساتھ ہر سال مئی/جون میں منعقد کیا جارہا ہے۔ اب تک بارھویں جماعت ریاضی (Math)، فزکس اور کیمسٹری (MPC) گروپ سے کامیاب یا سالِ آخر میں پڑھنے والے انجینئرنگ میں داخلے کے خواہش مندوں کے لیے سب سے پہلے لازمی ہے کہ وہ AIEEE میں شرکت کریں، ساتھ ساتھ اپنے ریاستی انٹرنس ٹسٹ بھی دیں مگر آج وہی تعلیم روزگار مارکیٹ میں قابلِ قبول ہے جو اچھی ہو، اچھے ادارے سے حاصل کی گئی ہو، اور اچھے نتیجے کے ساتھ حاصل کی گئی ہو۔ اگر ہم اچھی تعلیم حاصل کرتے ہیں مگر کمتر ادارے سے تو یہ حصولِ روزگار کے لیے کچھ مناسب نہیں۔ ہمیں موزوں وقت میں معیاری کورس، معیاری ادارے سے اور معیاری انداز سے حاصل کرنا ہوگا تبھی ہمارا کیریئر قابلِ رشک اور قابلِ تقلید ہوگا۔ ہم کامیاب ہوں گے تو گھر، خاندان سماج اور ملک کو بھی فائدہ پہنچا سکیں گے۔ □□□

161, Special C, Nehru Nagar, Kachiguda, Hyderabad-500027

نعیم احسن

چھٹی قسط

اِنٹرنیٹ گائیڈ

ویب براؤزنگ (Browsing The Web)

انٹرنیٹ پر ایک دستیاب میڈیا "ورلڈ وائڈ ویب" ہے۔ ویب جسے اکثر اوقات www یا w3 کہتے ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہائپرٹ ٹیکسٹ ڈاکومنٹس کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ ہائپرٹیکسٹ ڈاکومنٹ میں دوسرے ڈاکومنٹس کے لیے لنک شامل ہوتے ہیں۔ یہ بالکل مختلف قسم کی فائلوں کی صورت میں بھی ہوسکتے ہیں اور انٹرنیٹ کے لیے دوسری سائٹس بھی ہوسکتی ہیں۔ ایک ویب براؤزر کے ذریعے آپ ایک لنک سے دوسرے لنک پر جاسکتے ہیں اور لنکس کی ایک قطار کے مطابق چلتے ہوئے کسی بھی دلچسپی کی حامل سمت میں جایا جاسکتا ہے۔ اگرچہ ویب کے ذریعے ہر چیز انٹرنیٹ پر میسر نہیں ہے لیکن اس کے ذریعے آپ کو زیادہ سے زیادہ رابطے مل سکتے ہیں۔

ورلڈ وائڈ ویب کیا ہے؟

ورلڈ وائڈ ویب (www یا w3) انٹرنیٹ کی بہت سی شناختوں میں سے ایک شناخت ہے لیکن یہ اس قدر مقبول ہوگیا ہے کہ لوگ نیٹ کے لیے اسے واحد ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ویب نے انٹرنیٹ کو آسان بنا کر ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ونڈوز، DOS کے انٹرفیس کو بغیر اس کے بنیادی ڈھانچے میں تبدیلی کیے خوبصورت اور آسان بنا دیتا ہے۔ ویب بھی انٹرنیٹ کی وسیع انفارمیشن کے لیے خوبصورت انٹرفیس فراہم کرتا ہے۔

ویب دراصل انٹرنیٹ سے علاحدہ نہیں ہے اور نہ ہی اس میں کچھ فرق ہے۔ یہ صرف پہلے سے موجود چیزوں کے لیے انٹرفیس ہے۔

ویب کے ویو (View) اور اسے نیوگیٹ (navigate) کرنے کے لیے آپ کو ایک سافٹ ویئر کی ضرورت ہوتی ہے جسے ویب براؤزر (Web Browser) کہتے ہیں۔ براؤزر ویب میں اسٹور انفارمیشن کی تشریح کرتا ہے، انفارمیشن کو قابلِ مطالعہ شکل میں ٹرانسلیٹ کرتا ہے اور ایک رنگ برنگے ڈاکومنٹ کی صورت میں پیش کرتا ہے جسے آپ اسکرین پر دیکھتے ہیں۔ ہوسکتا ہے آپ پہلے ہی کوئی براؤزر جیسے نیٹ اسکیپ (Netscape) نیوی گیٹر، مائکروسافٹ انٹرنیٹ ایکسپلورر یا موزائیک استعمال کررہے ہوں لیکن ویب کا اصل حسن اور افادیت وہ براؤزنگ پروگرام ہے جو ویب کو پڑھ سکتا ہے۔ یہ ہر قسم کے ڈاٹا، پروگراموں، خبروں اور تصویروں وغیرہ تک آپ کی رسائی کو ممکن بناتا ہے اور ساتھ ہی اس کے لیے آپ کو مشکل کماٹڈیں اور ان کی درست ترتیب یاد رکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ویب ایڈریس (URLs)

ویب سائٹ کا ایڈریس یا URL (یونیفارم ریسورس لوکیٹر) عام طور پر ان حروف سے شروع ہوتا ہے :http۔ ویب ایڈریس کا آغاز ایک پروٹوکول کے نام سے ہوتا ہے۔ پروٹوکول سے مراد انفارمیشن کے لیے منسلک ہونے کا طریقہ ہے۔ اکثر اوقات یہ http ہی ہوتا ہے۔ یہ ہائپرٹیکسٹ ٹرانسفر پروٹوکول کا مخفف ہے۔ اس پروٹوکول کے بعد کولن اور پھر دو سلیش (//) آتے ہیں اور اس کے بعد بقیہ ایڈریس اس شکل میں لکھا جاتا ہے۔

www.urducouncil.nic.in

اوپر کی لائن میں دیے گئے اجزا سے ایک یو۔آر۔ایل مکمل ہوتا ہے تاہم بعض اوقات یو۔آر۔ایل میں کچھ اضافی سلیش اور نام بھی ہوسکتے ہیں۔ یہ ویب سرور پر مخصوص ڈائریکٹریوں اور فائلوں کی نشاندہی کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

URLs اور HTML، HTTP

انٹرنیٹ کے سلسلے میں ہم جب بھی بات کریں گے، تین تخفیف شدہ لفظ بار بار استعمال ہوں گے۔ ان کی اہمیت کے پیشِ نظر یہاں ان کی وضاحت کی جارہی ہے تاکہ آپ ان کو باہم خلط ملط نہ کردیں۔ کیونکہ یہ تینوں بالکل مختلف چیزیں ہیں۔

URL ایڈریس کی ایک شکل ہے جسے تمام ویب براؤزر سمجھ سکتے ہیں۔ یو۔آر۔ایل جیسا کہ بتایا جاچکا ہے "یونیفارم ریسورس لوکیٹر" کا مخفف ہے اور ایک یو۔آر۔ایل ہمیشہ اس صورت میں ہوتا ہے۔

Protocol//host.port/dir/filename.

وہ پروٹوکول جو عام طور پر ہائپرٹیکسٹ ڈاکومنٹس کے ساتھ لنک کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے http کہلاتا ہے جو کہ "ہائپرٹیکسٹ ٹرانسفر پروٹوکول" کا مخفف ہے۔ ایک براؤزر اسے استعمال کرکے ہی ہائپرٹیکسٹ ڈاکومنٹ کو ٹرانسفر کرتا ہے۔ اگر اس پروٹوکول کو استعمال کریں گے تو یو۔آر۔ایل کی اوپری جانے والی لائن میں "پروٹوکول" کی جگہ http آئے گا۔

تیسری چیز جو آپ کے لیے الجھن کا باعث بن سکتی ہے۔ HTML ہے۔ یہ "ہائپرٹیکسٹ مارک اَپ لینگویج" کا مخفف ہے اور یہ وہ کوڈ ہیں جو ہائپرٹیکسٹ ڈاکومنٹ بنانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ ویب پر ہائپرٹیکسٹ ڈاکومنٹس کی نشاندہی html ایکسٹنشن کے ذریعے ہوتی ہے۔

ویب براؤزر کا استعمال

عام طور پر جب آپ ایک براؤزر اسٹارٹ کرتے ہیں تو آپ ایک ہوم پیج (home page) شروع کرتے ہیں۔ یہ ایک نقطۂ آغاز ہے جسے آپ خود طے کرتے ہیں یا آپ کا براؤزر طے کرتا ہے۔ ہائپر ٹیکسٹ ڈاکومنٹس کو عام طور پر ویب پر pages کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہونے والا پیج یا تو آپ کے براؤزر کا ڈیفالٹ ہوم پیج ہوگا یا اگر آپ نے کسٹم پیج بنایا ہے تو وہ ہوگا۔ آپ کئی براؤزر کو براہ راست ویب ایڈریس پوائنٹ کرکے بھی شروع کرسکتے ہیں۔ کئی ای میل پروگرام جیسے ''یوڈورا'' اب یہ سہولت فراہم کرتے ہیں کہ ای میل میسج میں ایک URL پر ڈبل کلک کرنے سے سب سے آخر میں انسٹال ہونے والا براؤزر ایک منتخب کردہ ویب پیج کے ساتھ شروع ہوجاتا ہے۔

نیٹ اسکیپ نیوی گیٹر ایک مقبول عام براؤزر ہے۔ جب آپ اسے اسٹارٹ کرتے ہیں تو اس کا ہوم پیج خود بخود سامنے آجاتا ہے۔ تاآنکہ آپ نے اس کے آغاز کے لیے کوئی اور پیج طے نہ کردیا ہو۔

جب آپ کنکٹ ہو جائیں گے تو اس کے بعد آپ درج ذیل امور سرانجام دے سکتے ہیں:

اپنی دلچسپی کے لنکس کے مطابق آگے بڑھ سکتے ہیں۔ کسی بھی لنک پر آپ اپنے اقدامات کی چھان بین کرسکتے ہیں اور آپ کو پوری ہسٹری معلوم ہوسکتی ہے کہ ایک سیشن میں آپ نے کہاں سے آغاز کیا ہے ساتھ ہی ساتھ آپ ایک سیشن میں استعمال ہونے والے کسی بھی ویب پیج پر واپس جمپ بھی کرسکتے ہیں۔

جب آپ براؤزر اسٹارٹ کرتے ہیں تو کسی بھی مخصوص ویب ایڈریس (URL) پر جاسکتے ہیں۔ ویسے عام طور پر ڈیفالٹ پیج لوڈ ہونے کے عمل کو روکنے کے لیے آپ کو Stop بٹن استعمال کرنا پڑتا ہے اور براہ راست یو۔آر۔ایل کا اندراج کرنا پڑتا ہے۔

براؤزنگ کے دوران اپنی دلچسپی کے کسی بھی ویب پیج کے لیے آپ ایک مارک طے کرسکتے ہیں، جس کے ذریعے بعد میں بغیر پورے اقدامات کی چھان بین کے آپ براہ راست اپنی دلچسپی کے اس ویب پیج پر جمپ کرسکیں گے جس کے لیے آپ نے بک مارک طے کیا ہوگا۔

اپنی دلچسپی کی فائلوں اور ڈاکومنٹس کو ڈاؤن لوڈ کرکے محفوظ کرسکتے ہیں اور میل بھی کرسکتے ہیں۔

پروگرام کے ہوم پیج کسٹمائز کرسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر براؤزر اسٹارٹ ہونے پر ایک روایتی پیج کے بجائے آپ طے کرسکتے ہیں کہ پیج آپ کی دلچسپی کے لنکس کے ساتھ شروع ہو۔

کمانڈ اور مینو کے ذریعے پروگرام کے متعلق مدد حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس میں آپ کو پروگرام استعمال کرنے اور ویب کے متعلق کئی دوسری اہم معلومات حاصل کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

یہ دیکھ سکتے ہیں کہ نیٹ پر آپ کے لیے کیا کچھ نیا ہے۔

ویب براؤزر سے پیج ریڈنگ

ایک ویب پیج فارمیٹڈ ''ٹیکسٹ''، ہیڈنگز''، ''السٹریشن''، ''بیک گراؤنڈ آرٹ'' حاصل کرنے میں رنگین تاثرات اور ہائپر لنکس پر مشتمل ہوتا ہے جس کے ذریعے ٹیکسٹ یا آرٹ ہائی لائٹ کیا گیا ہوتا ہے۔ یہ لنکس زیادہ تر گرافیکل براؤزر میں نیلے رنگ میں ظاہر ہوتے ہیں (اگر ویب پیج بنانے والا کسی اور رنگ کو استعمال نہ کرے۔) اور انڈر لائن ہوتے ہیں۔ (اس کے لیے بھی فیصلہ ویب پیج بنانے والا ہی کرتا ہے۔ اگر وہ چاہے تو پروگرام کو اور طرح سے بھی کسٹمائز کرسکتا ہے۔)

اکثر اوقات ایک پیج ایک ہی وقت میں مکمل اسکرین پر ظاہر نہیں ہوتا۔

گرافیکل براؤزرز میں بالکل اسی طرح اسکرول بار استعمال ہوتے ہیں جس طرح آپ دوسرے ونڈوز کے پروگراموں میں کرتے ہیں اور اسکرولنگ کرکے پیج کے ان حصوں کو اسکرین پر لاسکتے ہیں جو ظاہر نہیں ہوتے۔ ایک طویل ڈاکومنٹ پیج سے اگر آپ کوئی مخصوص انفارمیشن حاصل کرنا چاہتے ہوں تو عام طور پر مینو کمانڈ کے ذریعے اس قسم کی تلاش کا عمل کیا جاسکتا ہے۔

لنک کا اتباع کرنا

ایک گرافیکل براؤزر میں ماؤس پوائنٹر کو لنک پر پوزیشن کرکے لنک کا اتباع کیا جاسکتا ہے۔ کسی ایکٹو لنک پر پہنچنے پر پوائنٹر کی شکل تبدیل ہوجاتی ہے۔ (جیسا کہ نیٹ اسکیپ میں کسی ایسے لنک پر جب ماؤس پوائنٹر پہنچتا ہے تو ایک چھوٹے سے ہاتھ کی شکل اختیار کرلیتا ہے جس میں شہادت کی انگلی اوپر اٹھی ہوتی ہے)۔ کسی بھی لنک پر ماؤس پوائنٹر کو لاکر ایک دفعہ کلک کردیں۔ (یہاں آپ کو ڈبل کلک کرنے کی عادت سے چھٹکارا پانے کی ضرورت ہے)۔

تمام براؤزرز میں ایک Back کمانڈ موجود ہوتا ہے اور اس کے لیے کوئی نہ کوئی شارٹ کٹ بھی وضع کیا گیا ہوتا ہے۔ مثلاً نیٹ اسکیپ کے مین مینو میں Go کے ڈراپ ڈاؤن مینو کے تحت ''بیک'' کمانڈ دستیاب ہے اور اس کے لیے شارٹ کٹ Alt+< ہے۔ اس کمانڈ پر شارٹ کٹ کے ذریعے آپ اپنے گزشتہ صفحات کے لیے کیے جانے والے اقدامات کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ ایک دفعہ آپ بیک کمانڈ کے ذریعے کسی صفحہ پر واپس چلے گئے تو آپ کو اس مینو کے تحت فارورڈ کمانڈ دستیاب ہوجائے گا جو عام صورتوں میں مدھم ہوتا ہے۔ اس کمانڈ کے استعمال سے آپ آگے کی جانب بڑھ سکتے

ہیں۔ اس کے علاوہ گرافیکل براؤزرز میں مینو کے ذریعے آپ ہسٹری لسٹ بھی حاصل کرسکتے ہیں۔ اس ہسٹری لسٹ کے ذریعے آپ کو ایک سیشن میں استعمال ہونے والے تمام Pages کی لسٹ مل سکتی ہے۔

ایک ہسٹری لسٹ میں تھلۂ آغاز سے لے کر آخر تک دیکھے جانے والے صفحات ایک ترتیب کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں لیکن جب آپ کسی جگہ واپس جاتے ہیں اور ایک مختلف لنک کا اتباع کرتے ہیں تو ہسٹری پاتھ میں تبدیلی آجاتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر آپ ''الف، ب، ج اور د'' سائٹ دیکھتے ہیں اس کے بعد Back کمانڈ کے ذریعے واپس ''ب'' سائٹ پر آتے ہیں اور پھر ''د'' سائٹ پر چلے جاتے ہیں تو ہسٹری پاتھ ایسے پڑھا جائے گا۔ ''الف، ب، د''

اگر آپ کے ذہن میں پہلے سے کوئی ایڈریس ہے جسے آپ نے کسی اشتہار میں دیکھا ہے، کسی نے آپ کو دیا ہے یا ای میل کے ذریعے آپ نے حاصل کیا ہے تو اکثر براؤزرز میں آپ کسی پیج کو دیکھنے کے لیے براہ راست یو. آر. ایل. ٹائپ کرسکتے ہیں بجائے اس کے کہ آپ لنکس کی ایک لمبی قطار کے ذریعے اس تک پہنچیں۔

اس کے علاوہ آپ کسی بھی وقت ڈیفالٹ ہوم پیج پر واپس جاسکتے ہیں۔ گرافیکل براؤزرز میں ایک ہوم بٹن ضرور موجود ہوتا ہے۔ جو عام طور پر ایک گھر کی طرح کے خوبصورت آئیکون کی صورت میں اس مقصد کے لیے وضع کیا جاتا ہے۔

بُک مارک بنانا

جب آپ ویب دیکھنے میں محو ہوتے ہیں اس وقت اپنی دلچسپی کی منازل کو بک مارک بنا کر محفوظ کرسکتے ہیں (بک مارک کو کچھ براؤزرز میں فیورٹس، فیورٹ پلیس اور ہاٹ لائن آئٹم بھی کہا جاتا ہے۔)۔ ایک دفعہ آپ نے بک مارک بنالیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے اپنی دل پسند منزل کے لیے شارٹ کٹ وضع کرلیا ہے جنھیں اگلی دفعہ آپ براہ راست سامنے لاسکتے ہیں۔

ڈاکومنٹ کو میل یا محفوظ کرنا

اگر کسی ویب پیج میں آپ کو ایسی معلومات ملتی ہیں جنھیں آپ کسی اور کو بھیجنا چاہیں یا اپنے کمپیوٹر پر اسٹور کرنا چاہیں تو اس کے لیے یا تو براؤزر کی میل کمانڈ کے ذریعے ڈاکومنٹ خود کو یا کسی اور کو بھیج دیں یا پھر براؤزر کی save کمانڈ کے ذریعے اسے محفوظ کرلیں۔ گرافیکل براؤزرز میں یہ عمل آپ مین مینو میں ''فائل'' اور اس کے تحت Save as کمانڈ کے ذریعے کرسکتے ہیں۔ ہارڈ ڈسک پر کسی ڈاکومنٹ کو محفوظ کرنے کا عمل بالکل ویسا ہی ہے جیسا دوسرے ونڈوز پروگراموں اور ورڈ پروسیسرز وغیرہ کا ہے۔

کسی لنک کا یو. آر. ایل. (URL) دیکھنا

اگر آپ کسی مخصوص لنک کے ساتھ ایسوسی ایٹ کیا گیا URL دیکھنا چاہیں تو دیکھ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر بہت سے براؤزرز میں جب آپ پوائنٹر کو کسی لنک پر لاتے ہیں تو ایسوسی ایٹڈ لنک پروگرام ونڈو کی نچلی جانب اسٹیٹس بار میں ظاہر ہوجاتا ہے۔ کئی براؤزرز ایسے ہیں جن میں یو. آر. ایل. کو آپ دائیں کلک سے کاپی کرسکتے ہیں جسے بعد ازاں مستقبل میں کسی حوالے کے لیے کسی دوسرے ڈاکومنٹ میں پیسٹ کیا جاسکتا ہے یا پھر ای میل کے پیغام میں پیسٹ کرکے آپ کسی اور کو اس ویب پیج کے متعلق مطلع بھی کرسکتے ہیں۔

ہوم پیج تبدیل کرنا

اگرچہ ہر براؤزر میں کمانڈیں مختلف ہوتی ہیں تاہم زیادہ تر براؤزرز کے ذریعے آپ ڈیفالٹ ہوم پیج کو کسی دوسرے پیج میں بدل سکتے ہیں اور اس کا انتخاب آپ اپنی بک مارک لسٹ میں سے بھی کرسکتے ہیں۔ لہٰذا آپ ویب ایکسپلورنگ کا عمل کسی بھی بہتر مقام سے شروع کرسکتے ہیں۔ عام طور پر ہوم پیج تبدیل کرنے کے لیے آپ کو ''آپشنز'' یا ''پریفرنس'' ایریا میں تبدیلی کرنی پڑتی ہے۔ یا پھر بالکل درست یو. آر. ایل. کے ذریعے براؤزر کو بتایا جاتا ہے کہ موجودہ منتخب کردہ پیج کو ہوم پیج کے طور پر استعمال کرے۔

ویب ہیلپ اور انفو

ویب ہیلپ کے لیے بڑی تعداد میں مفید ذرائع دستیاب ہیں۔ یہ ''ہائپر ٹیکسٹ'' اور ''پلین ٹیکسٹ ڈاکومنٹ'' دونوں صورتوں میں دستیاب ہیں۔ www FAQ ایک شاندار ڈاکومنٹ ہے۔ آپ اس کے لیے کوشش کرسکتے ہیں۔ اس کا یو. آر. ایل. اس طرح ہے۔

http://www.boutell.com/faq/

اسی طرح کئی انفرادی براؤزر اپنی ذاتی ہیلپ فائلیں بھی رکھتے ہیں جنھیں مینو کمانڈ کے ذریعے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

انٹرنیٹ پر کیا کچھ نیا ہے؟

اگر آپ اپنے آپ کو تازہ ترین اور دلچسپ ہوم پیجز کے متعلق باخبر رکھنا چاہتے ہیں تو NCSA کا جائزہ ضرور لیتے رہا کریں۔

NCSA what's New Page کو آپ ایک اَن آفیشل ویب نیوز پیپر کہہ سکتے ہیں۔ اس کے لیے یو. آر. ایل. اس طرح ہے۔

http://www.ncsa.uiuc.edu/SDG/Sofware/Mosaic/Docs/whats-new.html

کئی براؤزرز ایسے ہیں جن میں آپ کو what's New کمانڈ یا بٹن میسر ہوتا ہے اور بعض میں تو what's cool آپشن تک ہوتا ہے۔

(جاری) □□□ (تلخیص و ترتیب: محمد سلیم الدین ندوی)

محمد سہیم الدین ندوی

کوئز

لائبریری اینڈ انفارمیشن سائنس

(1) لائبریری سائنس ایک آرٹ ہے یا سائنس؟
(الف) آرٹ (ب) سائنس
(ج) آرٹ اور سائنس (د) ان میں سے کوئی نہیں

(2) اصطلاح "لائبریری سائنس" کس نے وضع کی؟
(الف) ڈیوی (ب) سایرس
(ج) رنگاناتھن (د) بلس

(3) دنیا میں لائبریری سائنس کے پہلے اسکول کا بانی کون تھا؟
(الف) ڈیوی (ب) سایرس
(ج) بلس (د) رنگاناتھن

(4) کس سن میں ڈیوی نے لائبریرین شپ کا پہلا اسکول شروع کیا؟
(الف) 1876 (ب) 1887
(ج) 1895 (د) 1933

(5) ہندستان کی کس یونیورسٹی نے لائبریری سائنس میں ڈپلوما کورس سب سے پہلے شروع کیا؟
(الف) مدراس (ب) بی.ایچ.یو
(ج) اے.ایم.یو. (د) دہلی یونیورسٹی

(6) ہندستان میں ہر سال لائبریری ہفتہ کب منایا جاتا ہے؟
(الف) 26/جنوری سے 2 فروری
(ب) 15/اگست سے 21/اگست
(ج) 2/اکتوبر سے 8/اکتوبر
(د) 14/نومبر سے 20/نومبر

(7) سال کے کس مہینے میں کتاب ہفتہ منایا جاتا ہے؟
(الف) اگست (ب) ستمبر
(ج) اکتوبر (د) نومبر

(8) ہندستان میں کس کو "فادر آف لائبریری موومنٹ" کہا جاتا ہے؟
(الف) وشوناتھن (ب) بی.ایس.کیساون
(ج) ایس.آر.رنگاناتھن (د) پی.این.کولا

(9) ہندستان میں "بابائے لائبریری سائنس" کس کو کہا جاتا ہے؟
(الف) ایس.آر.رنگاناتھن (ب) پی.این.کولا
(ج) بی.ایس.کیساون (د) ایس.شرما

(10) ڈاکٹر ایس.آر.رنگاناتھن کو لائبریری سائنس میں خدمات کے لیے کس ایوارڈ سے نوازا گیا؟
(الف) پدم بھوشن (ب) نوبل پرائز
(ج) پدم شری (د) گیان پیٹھ پُرسکار

(11) ہندستان کے لیے لائبریری ڈیولپمنٹ پلان کس نے تیار کیا؟
(الف) پی.این.کولا (ب) مولانا آزاد
(ج) ایس.آر.رنگاناتھن (د) رادھا کرشنن

(12) پاکستان کا رنگاناتھن کس کو کہا جاتا ہے؟
(الف) ڈاکٹر حمید (ب) ماجد علی خاں
(ج) محمد.کے.احمد (د) ڈاکٹر خورشید

(13) ہندستان میں لائبریری سائنس میں شائع ہونے والا پہلا جرنل ہے؟
(الف) جرنل آف لائبریری سائنس (ب) لائبریری مس سلینی
(ج) لائبریری سائنس جرنل (د) لائبریری ہیرالڈ

(14) امریکہ میں لائبریری ڈیولپمنٹ پلان کس نے تیار کیا؟
(الف) ڈیوی (ب) اے.ایل.اے.
(ج) سایرس (د) آئی.ایف.ایل.اے

(15) لائبریری آف کانگریس کس شہر میں ہے؟
(الف) نیویارک (ب) واشنگٹن ڈی.سی.
(ج) سین فرانسسکو (د) لندن

(16) ہندستان کی نیشنل سائنس لائبریری کس شہر میں ہے؟
(الف) نئی دہلی (ب) کلکتہ
(ج) مدراس (د) ممبئی

(17) خدا بخش اورینٹل لائبریری کس شہر میں ہے؟
(الف) کلکتہ (ب) ممبئی
(ج) پٹنہ (د) مدراس

(18) دنیا میں سب سے بڑی یونیورسٹی لائبریری کہاں ہے؟
(الف) ہارورڈ یونیورسٹی لائبریری، امریکہ
(ب) نیویارک یونیورسٹی لائبریری، امریکہ

(ج) دہلی یونیورسٹی لائبریری، ہندستان
(د) مدراس یونیورسٹی لائبریری، ہندستان

(19) آئی.ایل.اے. کے بانی کون ہیں؟
(الف) رادھا کرشنن (ب) رنگاناتھن
(ج) وشواناتھن (د) سوامی ناتھن

(20) علم کتب خانہ کے قوانین خمسہ (Five laws of Library Science) کے مصنف کون ہیں؟
(الف) ڈیوی (ب) رنگاناتھن
(ج) ساریس (د) وشواناتھن

(21) ہندستان میں ڈیپوزٹری آف بکس ایکٹ کس سن میں پاس ہوا؟
(الف) 1950 (ب) 1952
(ج) 1954 (د) 1956

(22) ہندستان میں کس سن میں سب سے پہلے لائبریری ایکٹ پاس ہوا؟
(الف) 1940 (ب) 1948
(ج) 1960 (د) 1965

(23) Manual of Library Classification and Shelf arrangement کے مصنف کون ہیں؟
(الف) جیمس ڈف براؤن (ب) سی.اے.کٹر
(ج) ڈبلیو.سی.بی.ساریس (د) ایچ.آئی.بلس

(24) D.D.C. کا پہلا ایڈیشن کس سن میں شائع ہوا؟
(الف) 1870 (ب) 1875
(ج) 1876 (د) 1897

(25) کیٹلاگنگ کے لیے قواعد سب سے پہلے کس نے تیار کیا؟
(الف) سی.اے.کٹر (ب) اے.پنیزی
(ج) ڈبلیو.سی.بی.ساریس (د) ایس.آر.رنگاناتھن

(26) AACR-1 کس سن میں شائع ہوئی؟
(الف) 1960 (ب) 1967
(ج) 1957 (د) 1970

(27) پرنٹڈ (printed) کیٹلاگ کو سب سے پہلے متعارف کرانے والی لائبریری ہے:
(الف) برٹش میوزیم (ب) لائبریری آف کانگریس
(ج) امپیریل لائبریری (د) لینن اسٹیٹ

(28) MARC پروجیکٹ کس نے شروع کیا؟
(الف) اے.ایل.اے. (ب) آئی.ایف.ایل.اے.
(ج) برٹش میوزیم (د) لائبریری آف کانگریس

(29) اصطلاح "Information" کا پہلی بار استعمال کس سن میں ہوا؟
(الف) 1955 (ب) 1950
(ج) 1960 (د) 1965

(30) Information Retrieval کا لفظ پہلی بار کس سن میں مستعمل ہوا؟
(الف) 1945 (ب) 1947
(ج) 1950 (د) 1955

(31) ببلوگرافی Bibliography کا استعمال سب سے پہلے کس نے کیا؟
(الف) ڈیوی (ب) رنگاناتھن
(ج) مارگریٹ مین (د) لوئس جیکب دی سینٹ چارلس

(32) پرسنل ببلوگرافی کیا ہے؟
(الف) مصنف انڈکس
(ب) مصنف ببلوگرافی
(ج) عنوان ببلوگرافی
(د) ایک شخصیت کے کام اور ایک شخصیت پر کام کی لسٹ

(33) مندرجۂ ذیل میں سے کون انفارمیشن کا بنیادی ماخذ (primary source) ہے؟
(الف) انڈکس (ب) لغات
(ج) مخطوطات (د) ببلوگرافی

(34) I.N.B. کا فل فارم کیا ہے؟
(الف) انٹرنیشنل ببلوگرافی (ب) انڈین نیشنل ببلوگرافی
(ج) انڈین نیشنل بیورو (د) انڈین نیشنل بک فیئر

(35) I.N.B. کتنی زبانوں کی کتابوں کا احاطہ کرتی ہے؟
(الف) 12 (ب) 13
(ج) 14 (د) 15

(36) ورلڈ آف لرننگ (World of Learning) کیا ہے؟
(الف) ایئر بک (ب) ڈائرکٹری
(ج) المناس (د) لغت

(37) LISA کا فل فارم کیا ہے؟
(الف) لائبریری سائنس ابسٹرکٹس

(ب) لائبریری اینڈ انفارمیشن سائنس ایسٹرکٹس

(ج) لائبریری اینڈ انفارمیشن ایسٹرکٹ

(د) لٹریچر سرچ اکیڈمی

(38) ہندستان میں ریفرنس سروس پہلی بار کس نے شروع کیا؟

(الف) پی.ایس. کساون (ب) اے.ڈی. ڈیلینسن

(ج) ڈبلیو. اے. بورڈن (د) رنگاناتھن

(39) INSDOC کا قیام کس سن میں عمل میں آیا؟

(الف) 1950 (ب) 1951

(ج) 1952 (د) 1953

(40) SENDOC کا قیام کب عمل میں آیا؟

(الف) 1952 (ب) 1962

(ج) 1971 (د) 1975

(41) PIS کا فل فارم کیا ہے؟

(الف) پیٹنٹ انسٹی ٹیوٹ آف سائنس

(ب) پیٹنٹ انفارمیشن سسٹم

(ج) پیٹنٹ انفارمیشن سروس

(د) پرسنل انفارمیشن سروس

(42) DRTC کا قیام کس سن میں عمل میں آیا؟

(الف) 1960 (ب) 1962

(ج) 1963 (د) 1965

(43) انفارمیشن لائبریری نیٹ ورک (INFLIBNET) کس ملک کا پروگرام ہے؟

(الف) انگلینڈ (ب) امریکہ

(ج) فرانس (د) ہندستان

(44) ڈاکٹر رنگاناتھن کو" ہندستان کے بابائے لائبریری" کا لقب کس نے دیا؟

(الف) راجندر پرشاد (ب) رادھا کرشنن

(ج) موریس گویر (د) جواہر لال نہرو

(45) Librametry اصطلاح کا موجد ہے:

(الف) سایرس (ب) ڈیوی

(ج) کٹر (د) رنگاناتھن

(46) LIBRA شائع ہوتا ہے:

(الف) یونیورسٹی آف دہلی سے (ب) یونیورسٹی آف راجستھان سے

(ج) لکھنؤ یونیورسٹی سے (د) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے

(47) موڈرن لائبریرین (Modern Librarian) پہلی بار کب شائع ہوا؟

(الف) 1890 (ب) 1900

(ج) 1930 (د) 1950

(48) انڈین سائنس ایسٹرکٹ کو شائع کرتی ہے؟

(الف) آئی.اے.ایس.ایل.آئی.سی.

(ب) آئی.این.ایس.ڈی.او.سی.

(ج) سی.ایس.آئی.آر.

(د) این.پی.ایل.

(49) ڈیوی جانا جاتا ہے؟

(الف) فہرست سازی کی وجہ سے

(ب) ریفرنس سروس کی وجہ سے

(ج) ڈوکومنٹیشن کی وجہ سے

(د) درجہ بندی کی وجہ سے

(50) لائبریری آف کانگریس کیا ہے؟

(الف) لائبریری آف انڈین کانگریس

(ب) انگلینڈ کی نیشنل لائبریری

(ج) ہندستان کی نیشنل لائبریری

(د) امریکہ کی نیشنل لائبریری

(51) دنیا کی سب سے پرانی لائبریری ایسوسی ایشن ہے:

(الف) لائبریری ایسوسی ایشن، برطانیہ

(ب) امریکن لائبریری ایسوسی ایشن

(ج) انڈین لائبریری ایسوسی ایشن

(د) برٹش لائبریری ایسوسی ایشن

(52) انڈین لائبریری ایسوسی ایشن کے بانی کون ہیں؟

(الف) ڈی.این. مارشل (ب) ایس.آر. رنگاناتھن

(ج) پی.این. کولا (د) پی.ایس. کساون

(جوابات اسی شمارے میں تلاش کریں)

□□□

C-81, Abul Fazal Enclave, Jamia Nagar, New Delhi-25

فیروز عالم

کمپیوٹر سینٹر کے فارغ طلبہ کے انٹرویو-5

بڑھتے قدم

نبیلہ جمال نے، جن کے والدِ محترم جمیل الرحمان پرنٹنگ پریس کے مالک اور کتابوں کی کتابت و طباعت سے وابستہ تھے اور والدہ محترمہ جمیلہ بیگم House Wife ہیں، بارھویں جماعت تک ایک پبلک اسکول میں تعلیم حاصل کی اور پھر بی۔اے۔پاس کورس میں ذاکر حسین کالج میں داخلہ لیا۔ بی۔اے۔ کے دوران ہی انھوں نے کونسل کا ایک سالہ ڈپلومہ اِن کمپیوٹر ایپلی کیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی۔ٹی۔پی۔ کورس کیا۔ فی الحال عوامی کمپیوٹر سینٹر میں کمپیوٹر استاد کی حیثیت سے پڑھا رہی ہیں۔ ان کا مختصر انٹرویو قارئینِ ”اردو دنیا“ کے لیے پیش ہے۔

سوال: کمپیوٹر سے آپ کو کیسے دلچسپی ہوئی؟

جواب: بچپن سے ہی کمپیوٹر سے دلچسپی تھی۔ اسکولنگ کے دوقت بھی ہمیں کمپیوٹر کے بابت بتایا جاتا تھا جس سے ہمارے اندر اس کو سیکھنے کی تمنا پیدا ہوئی۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر دوسرے سینٹروں سے کس اعتبار سے مختلف ہیں؟

جواب: پہلی بات تو یہ کہ یہاں اردو سکھائی جاتی ہے جبکہ دوسرے سینٹروں میں یہ سہولیات دستیاب نہیں ہیں۔ دوسری بات یہ کہ یہاں جو ہمیں کورس میٹریل ملتا ہے وہ کافی بہتر اور کمپیوٹر سیکھنے کے لیے بے حد مفید و کارآمد ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ یہاں سے ہمیں جو سرٹیفکیٹ ملتا ہے وہ وزارتِ ترقی انسانی وسائل کا ہے۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹروں میں جو تربیت دی جا رہی ہے، اُس سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

جواب: پوری طرح مطمئن ہوں کیونکہ اس میں پریکٹکل کے لیے پورا پورا وقت ملتا ہے، ساتھ ہی اساتذہ بھی مشفق ہیں اور تربیت کے دوران پوری طرح معاون ہوتے ہیں۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر اُردو داں طبقے کو روزگار فراہم کرانے میں کس حد تک معاون ہیں؟

جواب: اس دور میں نوکری تلاش کرنا کسی بھی میدان میں بہت مشکل کام ہے اور نوکری ملنا تو تقریباً ناممکن ہے لیکن اس کورس میں اردو سافٹ ویئر کے ساتھ ساتھ ڈیزائننگ وغیرہ کی وجہ سے کام کرنے اور جاب تلاش کرنے میں کافی مدد ملتی ہے۔

سوال: انفارمیشن ٹیکنالوجی کی دنیا کا حصہ بن کر آپ کو کیسا لگ رہا ہے؟

جواب: بہت اچھا لگ رہا ہے کیونکہ اس دور میں کمپیوٹر کے بغیر کچھ کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

سوال: اس میدان میں آنے کے بعد کیا آپ میں کوئی بدلاؤ آیا ہے؟ کیا آپ کی خوداعتمادی اور خودانحصاری میں اضافہ ہوا ہے؟

جواب: خوداعتمادی وخودانحصاری میں کافی حد تک اضافہ ہوا ہے کیونکہ اس کی وجہ سے ہم کوئی بھی جاب بہ آسانی کر سکتے ہیں جس میں ہمیں کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

سوال: آپ لازمی طور پر ملٹی لنگول ہیں۔ یہ آپ کے لیے ایک بے حد مثبت چیز ہے۔ آپ اپنی اس خصوصیت کی بنا پر مارکیٹ میں اپنے آپ کو کس مقام پر پاتی ہیں؟

جواب: ملٹی لنگول ہونے کی وجہ سے ہم کئی زبانوں میں کام کر سکتے ہیں اور چونکہ اس وقت کمپیوٹر سے وابستہ لوگ اردو سے زیادہ واقف نہیں ہیں، اس وجہ کر جو لوگ اردو کے ساتھ ساتھ ہندی اور انگریزی بھی جانتے ہیں، انھیں فطری طور پر اس کا فائدہ حاصل ہوگا۔

سوال: آپ نے کمپیوٹر سینٹر میں جو فیس ادا کی، وہ آپ کے لیے بوجھ تو نہ تھی؟

جواب: بظاہر کورس کے حساب سے دیکھا جائے تو فیس مناسب ہے لیکن بہت سے طلبہ ایسے ہوتے ہیں جنھیں فیس ادا کرنے میں کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور انھیں یہ فیس بوجھ لگتی ہے۔ اس لیے اگر اس میں خاص طور سے غریب طلبہ کے لیے باقاعدہ (بعض جگہ کنسیشن دی جاتی ہے) ہر سینٹر میں کنسیشن کی اسکیم رکھی جاتی تو اس کورس سے زیادہ سے زیادہ لوگ فائدہ اٹھا پاتے۔ □□□

اردو خبرنامہ

قومی اردو کونسل کی تشکیلِ نو

● قومی اردو کونسل جو پچھلے کئی برسوں سے اردو کے فروغ میں ایک کلیدی رول ادا کررہی ہے اور جسے اردو زبان کی ترویج و ترقی کے لیے قومی مقتدرہ کی حیثیت حاصل ہے، اس کی تشکیلِ نو کا حکومتِ ہند نے اعلان کیا ہے۔ مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی نو تشکیل شدہ کونسل کے چیئر مین اور پروفیسر گوپی چند نارنگ نائب چیئر مین ہوں گے۔

حکومتِ ہند نے قومی اردو کونسل کو ہندستان بھر میں فروغِ اردو کے مختلف پروگراموں میں تال میل پیدا کرنے اور ان کی نگرانی کرنے والے ادارے کے طور پر تسلیم کیا ہے۔ کونسل ایک ایسے مقتدرہ کے طور پر کام کرتی ہے جو پرائمری اور سیکنڈری سطح پر اردو ذریعۂ تعلیم کے اداروں کے لیے تعلیمی اور تکنیکی Inputs فراہم کرے تاکہ اردو ذریعۂ تعلیم کے ادارے اور ان کا نصاب قومی معیار اور قومی مقاصد سے ہم آہنگ ہوسکیں۔ نو تشکیل شدہ کونسل کے اراکین اور مجلسِ منتظمہ کی فہرست درج ذیل ہے:

کونسل کے اراکین:

1- وزیرِ مملکت برائے ترقی انسانی وسائل (چیئر مین)
2- پروفیسر گوپی چند نارنگ (نائب چیئر مین)

اردو رضاکار اداروں کے نمائندے:

3- جناب پی. اے. انعامدار، پونہ
4- جناب رمیندر جاکھو ساحل، چنڈی گڑھ
5- ڈاکٹر خلیق انجم، نئی دہلی
6- ڈاکٹر ممتاز احمد، بنگلور

اردو اسکالر:

7- جناب گلزار، ممبئی
8- پروفیسر نصیر احمد خاں، نئی دہلی
9- پروفیسر ابوالکلام قاسمی، علی گڑھ
10- پروفیسر سیدہ جعفر، حیدرآباد
11- پروفیسر جگن ناتھ آزاد، جموں توی
12- پروفیسر سید جعفر رضا، الٰہ آباد

اردو میں دلچسپی رکھنے والی اہم شخصیتیں:

13- جناب ایم. کے. کاؤ، نئی دہلی
14- ڈاکٹر یامین اختر فاروقی، تھانہ
15- جناب مدن گوپال، نئی دہلی
16- ڈاکٹر رفیق زکریا، ممبئی
17- جناب فضیل جعفری، ممبئی
18- جناب موہن چراغی، نئی دہلی

محکمۂ تعلیم، وزارتِ ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند کے نمائندگان:

19- صلاح کار برائے امور مالیات، وزارتِ ترقی انسانی وسائل، محکمۂ ثانوی و اعلا تعلیم، حکومتِ ہند
20- جوائنٹ سکریٹری (لنگویجز)

قابلِ لحاظ اردو آبادی والے صوبوں اور مرکزی علاقوں کے نمائندے:

21- پروفیسر محمد حلیم خاں، بھوپال
22- جناب کشمیری لال ذاکر، چنڈی گڑھ
23- جناب ایم. ایس. خاں، گوا
24- جناب شکیل احمد، اجمیر
25- چیئر مین، کمیشن برائے سائنسی اور تکنیکی اصطلاحات، نئی دہلی
26- ڈائرکٹر، سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز، میسور
27- ڈائرکٹر، سینٹرل ہندی ڈائرکٹوریٹ، نئی دہلی
28- ڈائرکٹر، کیندریہ ہندی سنستھان، آگرہ
29- ڈائرکٹر، نیشنل کونسل فار ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، نئی دہلی
30- یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کا نمائندہ
31- ہندستانی کونسل برائے ثقافتی تعلقات (ICCR) کا نمائندہ
32- وزارتِ قانون کا نمائندہ۔

کونسل کے ایگزیکیٹو بورڈ کے چیئر مین وزیرِ مملکت برائے ترقی انسانی وسائل اور نائب چیئر مین پروفیسر گوپی چند نارنگ ہوں گے۔ ایگزیکیٹو بورڈ کے اراکین میں جوائنٹ سکریٹری (لنگویجز)، صلاح کار برائے امور مالیات، وزارتِ ترقی انسانی وسائل، محکمۂ ثانوی و اعلا تعلیم، حکومتِ ہند، جناب گلزار، ڈاکٹر رفیق زکریا، جناب رمیندر جاکھو ساحل، پروفیسر حلیم خاں، جناب ایم. ایس. خاں اور قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر شامل ہیں۔

مصحفی کی حیات وخدمات پر مذاکرہ

● دہلی، 22/اکتوبر۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے کلاسیکی ادب کے عظیم شاعر شیخ غلام ہمدانی مصحفی کی حیات وخدمات کے موضوع پر منعقدہ دوروزہ سمینار کا افتتاح کرتے ہوئے معروف دانشور اور ناقد جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے کہا کہ حقیقت میں مصحفی جیسے اہم شاعر پر اب تک کوئی بڑا کام نہیں ہوا۔ انھوں نے غالب انسٹی ٹیوٹ کی اس کوشش کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ مصحفی پر منعقدہ اس سمینار سے ہمیں مصحفی کی زندگی اور ان کے شعری کارنامے کو سمجھنے میں کافی مدد ملے گی۔ جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے مصحفی پر محمد حسین آزاد اور فراق گورکھپوری کے مضامین کے حوالے سے کہا کہ ان حضرات نے مصحفی کی ادبی شخصیت کو متعین کرنے اور ان کے شعری پیمانے کو ناپنے کی بہت کم کوشش کی ہے۔ انھوں نے مصحفی کے چند اشعار پڑھ کر کہا کہ یہ اشعار اتنے معیاری ہیں کہ اس دور میں اس معیار کی شاعری ہمیں نظر نہیں آتی۔ اس سے قبل سکریٹری غالب انسٹی ٹیوٹ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سمینار میں ہم غالب کے طفیل میں اپنے تہذیبی ورثے کی تلاش میں ہیں اور مصحفی پر سمینار کا مقصد یہی ہے کہ ہم عہدِ غالب، معاصرینِ غالب، پیش روئے غالب اور پس روئے غالب پر سمینار منعقد کریں، جن کا کسی نہ کسی حد تک غالب سے رشتہ رہا ہے۔ اس موقعے پر انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر جناب شاہد ماہلی نے کہا کہ اس سمینار کا مقصد اس عظیم کلاسیکی شاعر کی زندگی اور شاعری کے بعض اہم نکات کی تحقیق وتنقید ہے جو نکات اب تک ہماری نظروں سے پوشیدہ تھے۔ پروفیسر سید امیر حسن عابدی نے بھی جلسے کو خطاب کیا۔ آخر میں خواجہ حسن ثانی نظامی نے اس افتتاحی اجلاس کے تمام شرکا اور مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔

سمینار کا پہلا اجلاس ڈاکٹر خلیق انجم کی صدارت میں ہوا جس میں جناب سرور الہدیٰ نے ''مصحفی اور تذکرہ خوش معرکۂ زیبا''، ڈاکٹر حسن عباس نے ''مصحفی کی قصیدہ گوئی اور قصائدِ مصحفی کا ایک اہم مخطوطہ'' اور پروفیسر نورالحسن نقوی نے ''مصحفی کی ہجوگوئی'' کے عنوان سے اپنے مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر رضا حیدر نے کی۔ سمینار کے دوسرے اجلاس میں پروفیسر شمیم حنفی بحیثیت صدر موجود تھے۔ اس میں ڈاکٹر احمد محفوظ نے ''مصحفی کی شاعری کے بارے میں کچھ باتیں''، ڈاکٹر وسیم بیگم نے ''مصحفی کا اسلوبِ شعر''، ڈاکٹر اسلم پرویز نے ''نکاتِ سخن کی بابت ایک بات مصحفی کے حوالے سے'' اور ڈاکٹر خلیق انجم نے ''مصحفی کے سوانح'' کے عنوان سے مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے کی۔ سمینار کے پہلے دن کے آخری اجلاس میں ڈاکٹر سراج اجملی نے ''مصحفی کا رنگ''، اور ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے ''مصحفی کے باغِ قصائد کی میر'' کے عنوان سے مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس کی صدارت ڈاکٹر اسلم پرویز نے کی اور نظامت کا فریضہ ڈاکٹر مظہر مہدی نے انجام دیا۔

سمینار کے دوسرے دن کے پہلے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے کی۔ اس میں جناب مصباح احمد صدیقی نے ''مصحفی امروہہ میں''، ڈاکٹر شمس بدایونی نے ''مصحفی آنولہ میں'' اور پروفیسر قاضی جمال حسین نے ''مصحفی کی انفرادیت کا مسئلہ'' کے عنوان سے مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر احمد محفوظ نے کی۔ دوسرے اجلاس میں پروفیسر نثار احمد فاروقی نے ''مصحفی دلّی میں''، ڈاکٹر فاطمہ بیگم نے ''مصحفی کی غزل گوئی ایک مطالعہ''، پروفیسر شمیم حنفی نے ''مصحفی کا شعر'' اور ڈاکٹر کاظم علی خاں نے ''مصحفی لکھنؤ میں'' کے زیرِ عنوان مقالے پیش کیے۔ اجلاس کی صدارت ڈاکٹر تنویر احمد علوی اور جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے انجام دی اور نظامت جناب اشفاق عارفی نے کی۔

سمینار کے اختتامی اجلاس کی صدارت پروفیسر نورالحسن نقوی نے کی۔ اس میں ڈاکٹر رضا حیدر نے ''مصحفی کی شاعری میں داخلی عناصر''، ڈاکٹر شمس الحق عثمانی نے ''محبت کی زبان مصحفی'' اور ڈاکٹر ریحانہ خاتون نے ''مصحفی کے تذکروں کی ادبی اہمیت'' کے عنوان سے مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر سراج اجملی نے کی۔ سمینار کے اختتام پر پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے سامعین، اساتذہ، طلبہ اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

(ڈاک سے)

بین الاقوامی انیس ودبیر سمینار

● لندن، 18/اکتوبر۔ میر انیس اور مرزا دبیر کے دوسو سالہ یومِ ولادت کے موقعے پر انیس ودبیر اکیڈمی، لندن کی جانب سے ''اردو ادب میں انیس و دبیر کا مقام'' کے موضوع پر ایک بین الاقوامی سمینار کا انعقاد ہوا جس میں ہندستان، پاکستان، کناڈا، امریکہ، آسٹریلیا اور برطانیہ کے متعدد ادیبوں اور دانشوروں نے شرکت کی۔ افتتاحی اجلاس میں کناڈا کے ڈاکٹر تقی عابدی نے ''رباعیاتِ دبیر'' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر محمود الحسن رضوی، صفدر جعفری، سید محمد شبر، رشید منظر اور محترمہ مہر خاں نے اور نظامت ڈاکٹر اقبال مرزا نے کی۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر سحر انصاری، پروفیسر عبدالستار دلوی، پروفیسر قمر جہاں، ڈاکٹر غیور جعفری اور جناب اشفاق حسین نے کی۔ اس اجلاس میں ''دبیر کی نثر نگاری'' پر پروفیسر محمد زماں آزردہ، دہلی یونیورسٹی کے ڈاکٹر ابن کنول نے ''مراثیِ انیس ودبیر میں ہندستانی معاشرت''، ڈاکٹر اقبال مرزا نے ''انیس اور شیکسپیئر کی مماثلت'' اور رضا علی عابدی نے دبیر پر مقالے پیش کیے۔ تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر محمد زماں

آزردہ، ڈاکٹر ابن کنول، ظفر نقوی اور راد ھے شیام عارف نے کی اس اجلاس میں پروفیسر سحر انصاری، پروفیسر محمود الحسن، ساحر شیوی اور رشید مظہر نے اپنے مقالات پیش کیے۔ نظامت ڈاکٹر جاوید شیخ نے کی۔ آخری اجلاس کی صدارت امریکہ کے ڈاکٹر محمد مودودی، لکھنؤ، سوہن راہی اور ابرار خاں نے کی۔ اس اجلاس میں پروفیسر قمر جہاں اور برطانیہ کے یاور عباس نے اپنے مقالات پیش کیے۔ سمینار کے آخر میں مسالمہ منعقد ہوا۔ جس کی صدارت پروفیسر سحر انصاری، پروفیسر محمد زماں آزردہ، پروفیسر محمود الحسن اور ڈاکٹر ابن کنول نے کی۔ مسالمہ میں اشفاق حسین، عقیل دانش، رشید مظہر، ڈاکٹر اقبال مرزا، گلشن لکھنؤ، سوہن راہی، اکبر حیدر آبادی، ڈاکٹر غفار عزم کے علاوہ متعدد شعرا نے اپنا کلام پیش کیا۔

(قومی آواز، دہلی)

''غالب اور حیدر آباد'' توسیعی خطبہ

● نئی دہلی، 11 راکتوبر۔ غالب اکیڈمی، نئی دہلی میں ''غالب اور حیدر آباد'' کے موضوع پر توسیعی خطبہ دیتے ہوئے ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب نے کہا کہ غالب کمال درجے کے منکسر المزاج رہے لیکن علمی معاملات اور نتائج کو برقرار رکھتے تھے۔ وہ معاشی حالت مستحکم کرنے کے لیے مسلسل جدوجہد کرتے رہے۔ پنشن کے لیے وہ کلکتہ تک گئے اور یہ سلسلہ حیدر آباد تک پھیلا ہوا ہے۔ تاریخ نے غالب کو حیدر آباد جانے کا مشورہ بھی دیا لیکن غالب حیدر آباد نہیں گئے پھر بھی حیدر آباد کے لوگ ان سے بخوبی واقف تھے۔ ان کے کلام کو شوق سے پڑھتے تھے۔ غالب نے شمس الامرا، مختار الملک اور سالار جنگ کو قصیدہ لکھ کر بھیجا جو سالار جنگ میوزیم میں آج بھی موجود ہے۔ غالب کے نجی خطوط بھی حیدر آباد کے قربان علی کے نام ملتے ہیں۔ حیدر آباد میں غالب کے بے شمار شاگرد ہیں۔ ان کی اشاعت بھی حیدر آباد سے ہوئی اور پہلی شرح بھی حیدر آباد سے ہی شائع ہوئی۔

پروفیسر نثار احمد فاروقی نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ غالب کی آمدنی 162 روپے ماہانہ تھی جو اس زمانے میں زندگی گزارنے کے لیے کافی تھی لیکن غالب کے ساتھ نجم الدولہ، دبیر الملک کا خطاب جڑا ہوا تھا اور اتنے بڑے خطاب والے کو اس آمدنی میں زندگی گزارنا دشوار تھا۔ جناب خواجہ حسن ثانی نظامی نے بھی جلسے میں اظہار خیال کیا۔ اس موقعے پر متین امروہوی نے اپنا کلام پیش کیا۔

(ڈاک سے)

یوم سرسید تقاریب

● علی گڑھ، 7 راکتوبر۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ''مسلمانوں کی پسپائی کے اسباب اور پیش رفت کی تدابیر'' کے موضوع پر سرسید یادگاری خطبہ پیش کرتے ہوئے جامعہ ہمدرد کے چانسلر جناب سید حامد نے کہا کہ زراعتی اور صنعتی انقلابات کے بعد اب اطلاعات کے انقلاب میں بھی مسلمان بہت پیچھے ہیں۔ علم و حکمت جو ہمارا ایمان تھا، اسے ہم چھوڑ بیٹھے ہیں اور اصولوں کو چھوڑ کر رسموں کے پابند ہو گئے ہیں۔

تعلیم اور تحقیق سے غفلت ہماری پسماندگی کی ایک بنیادی وجہ ہے۔ انھوں نے تجویز پیش کی کہ شمالی ہندستان کی چار یونیورسٹیوں — علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ ہمدرد اور کشمیر یونیورسٹی کو تحقیقی، فلاحی اور تعمیری ارتباط کی طرف قدم بڑھانا چاہیے کیونکہ ان چار یونیورسٹیوں پر مسلمانوں کا زیادہ حق ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کی پسماندگی کے اسباب بیان کرتے ہوئے کہا کہ آزادی کا فقدان، جستجو اور تحقیق کی روایت کا خاتمہ اور کاہلی بنیادی وجوہات ہیں۔

مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر نے کہا کہ ہمیں ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی فضا پیدا کرنے کے لیے آگے آنا چاہیے، جب تک ملک میں امن و سکون نہیں ہوگا مسلمان ترقی نہیں کر سکتے۔ سرسید یادگاری خطبے کی صدارت کرتے ہوئے مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر نسیم احمد نے کہا کہ میری کوشش ہوگی کہ علی گڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ ہمدرد، کشمیر یونیورسٹی اور کالی کٹ یونیورسٹی کے لوگ مسلمانوں کی پسماندگی کے اسباب کا جائزہ لیں اور ان کے حل کے لیے عملی تجاویز پیش کریں۔ انھوں نے کہا کہ اس ادارے میں ہی ملت کی پسماندگی کے حل کے لیے سوچ شروع ہونی چاہیے اور ہمیں کسی بڑے منصوبے کے بجائے چھوٹے چھوٹے کاموں سے آغاز کرنا چاہیے اور دوسرے مذاہب کے لوگوں سے بھی ہمارا رابطہ ہونا چاہیے تاکہ ماحول کو سازگار بنایا جا سکے۔

سرسید اکادمی کے ڈائرکٹر پروفیسر اصغر عباس نے کہا کہ ملک کی اخلاقی، تعلیمی اور تہذیبی بیداری کے حصول کے لیے سید حامد صاحب جس طرح عمر کے اس حصے میں سرگرداں رہتے ہیں، اس کی دوسری کوئی مثال ہمارے زمانے میں نہیں ہے۔ اس موقعے پر وائس چانسلر نسیم احمد نے سرسید احمد خاں کی تصنیف ''خطبات احمدیہ'' کا تازہ علمی ایڈیشن، دستاویزات مسلم ایجوکیشنل کانفرنس مرتبہ پروفیسر اقبال حسین، پروفیسر پرمانند شاستری کی سرسید پر سنسکرت میں کتاب اور شعبۂ عربی کے استاد ڈاکٹر محمد صلاح الدین عمری کی عربی زبان میں ''سرسید احمد خاں: حیات و افکار'' کا اجرا کیا۔ آخر میں شعبۂ اردو کی صدر پروفیسر قیصر جہاں نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● عزر، 2 راکتوبر۔ ''آج ہماری قومی زبوں حالی کے جو بھی اسباب ہیں ہم ان کا سنجیدگی سے مواخذہ آخر کب تک نہیں لیں گے؟ ہمارے مخالفین ہمیں میڈیا کی طاقت کے بل پر آج دنیا کے سامنے ایک دہشت گرد قوم کے طور پر پیش کر رہے ہیں، ہمارے دانشور اور رہنما اس کی توڑ کے لیے ترجیحی بنیادوں پر کوششیں کیوں نہیں کر رہے ہیں؟ ہم کسی مسیحا کا انتظار آخر کب تک کرتے رہیں

گے؟ یہ تھے وہ سوال جو اردو منزل "عرعر" میں ہونے والے سرسید سمینار کے شرکا ڈاکٹر حنیف ترین، محمد عبدالملک ذاکر، محمد عبدالہادی، عرفان الٰہی دلاور، ڈاکٹر کاظم آغا، نصرت عالم، ڈاکٹر آفتاب، شاہ نواز خاں، ڈاکٹر جمال، آصف بھٹی اور ظل الرحمان قاسمی نے اس محفل میں اٹھائے اور ان کے جوابات پر بحث کی۔ سمینار کا انعقاد ڈاکٹر منیر احمد شریف اور بزمِ احبابِ سخن عرعر کے کارکنان امتیاز اعظمی، رئیس احمد میرٹھی، محمد ظہیر، محمد یوسف، محمد اسلم، محمد معراج اور گلزار احمد وغیرہ نے شہرِ عرعر کی اردو منزل میں "سرسید ڈے" کے موقعے پر کیا۔ "تعلیم اور مسلمانانِ برِصغیر" کے موضوع پر منعقدہ اس سمینار کے تمام مقررین اس بات پر متفق تھے کہ مسلمان مایوسی اور اپنے کربِ مسلسل سے اسی وقت نجات پا سکتے ہیں جب وہ مذہب کی اصل روح سے دوری، ناخواندگی اور لاپرواہی کا عملی طور پر خاتمہ کردیں۔

پروگرام کا آغاز ظل الرحمان قاسمی نے تلاوتِ کلامِ پاک سے کیا جس کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ترانہ پیش کیا گیا۔ آصف بھٹی صاحب کو بزم احباب سخن میں شمولیت پر ایک استقبالیہ بھی دیا گیا۔ ڈاکٹر حنیف ترین اس محفل میں بحیثیت مہمانِ خصوصی شریک ہوئے اور جلسے کی نظامت ظل الرحمان قاسمی نے انجام دی۔ آخر میں جناب آصف احمد بھٹی نے اپنی نظم "میں باغی ہوں" اور ڈاکٹر حنیف ترین نے اپنی تازہ تخلیق "باغی سچے ہوتے ہیں" پیش کی۔ (ڈاک سے)

● میرٹھ، 15/اکتوبر چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں بزمِ اردو کی طرف سے سرسیّد کی یومِ ولادت کے موقعے پر "جشنِ سرسیّد" کے سہ روزہ پروگراموں کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کی۔ جبکہ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے حاجی شاہد اخلاق (میئر میرٹھ) نے شرکت کی۔ اس موقعے پر مہمانِ خصوصی نے کہا کہ سرسید نے ہمارے ملک میں قومی یکجہتی اور تعلیم کے فروغ کے لیے جو جد و جہد کی تھی، آج بھی اس کی بہت ضرورت ہے کیوں کہ اس کے بغیر ملک ترقی نہیں کرسکتا۔ افتتاحی پروگرام میں مہمانِ ذی وقار موہت رستوگی کے علاوہ سید مظفر الدین اور شاداب علیم نے اپنے مقالے پیش کیے۔ اس کے بعد تقریری مقابلہ ہوا جس میں یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کے علاوہ متعدد کالجوں کے طالب علموں نے حصہ لیا۔ یہ مقابلہ اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں ہوا۔ اردو میں اوّل انعام فرمان احمد دوئم کنور محمد یونس (شعبۂ اردو)، سوئم شمیم الرحمٰن (فیضِ عام کالج) اور حوصلہ افزائی انعام سہیل احمد (خورجہ کالج) نے حاصل کیے۔ اسی طرح ہندی میں اوّل انعام روپیش کمار (شعبۂ سوشیولوجی)، دوئم سنیل کمار (شعبۂ ہندی)، سوئم منوج کمار (شعبۂ تعلیمات) اور حوصلہ افزائی انعام کماری پراچی (شعبۂ ہندی) نے حاصل کیے۔ بعد ازاں "سرسیّد کا قومی نظریہ" تحریری مقابلہ ہوا جس میں اوّل انعام شاداب علیم، دوئم گلزار احمد اور سوئم انعام شاہویز زیدی (شعبۂ اردو) نے حاصل کیے۔

"شامِ افسانہ" پر مشتمل محفل کی صدارت جناب طالب زیدی نے کی اور مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے محترم جوگیندر پال نے شرکت کی۔ انھوں نے متعدد مختصر کہانیاں پیش کیں۔ محترم افشاں ملک نے "یاجوج ماجوج"، خسرو متین نے "دوسرا گدھ"، ڈاکٹر نگار عظیم نے "فریم" اور انجم عثمانی نے "شہر گریہ کے مکیں" کے عنوان سے افسانے اور سعود اختر نے "جہالت کی حمایت" کے عنوان سے انشائیہ پیش کیا۔ دوسرے دن پہلی نشست میں بیت بازی کا مقابلہ ہوا جس میں مہمانِ خصوصی محترم راج کمار (رجسٹرار) تھے جبکہ صدارت ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کی۔ اس مقابلے میں اوّل انعام فیضِ عام کالج کی ٹیم نے، دوئم شعبۂ اردو کی ٹیم نے، سوئم انعام شعبۂ ہندی کی ٹیم نے اور اچھے شعر کہنے کا خصوصی انعام شاداب علیم (شعبۂ اردو) نے حاصل کیا۔ غزل سرائی کے مقابلے میں جشن سرسیّد کے تحت مشاعرے کا بھی انعقاد کیا گیا۔ (ڈاک سے)

● دربھنگہ، 26/اکتوبر۔ دربھنگہ آئیڈیل انگلش اسکول، خانقاہ چوک، دربھنگہ میں "اردو فورم" کے زیرِ اہتمام یومِ سرسید کے تحت بعنوان "مسلمانوں میں تعلیمی پسماندگی اور بیداری" پر مذاکرہ ہوا جس میں شہر کی معروف علمی اور ادبی شخصیتوں نے شرکت کی۔ مذاکرے کی صدارت ایل۔ این۔ ایم۔ یو۔ کے شعبۂ اردو کے سابق صدر ڈاکٹر کمال الدین نے کی اور بطور مہمانِ خصوصی دربھنگہ ضلع کانگریس کے صدر ڈاکٹر قمر الحسن شریک ہوئے۔ ابتدا میں سب سے پہلے معروف صحافی اور مدیر "جہانِ اردو" ڈاکٹر مشتاق احمد نے سرسید کی شخصیت کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی۔ آخر میں ڈاکٹر کمال الدین نے کہا کہ سرسید جیسی عہد ساز شخصیات کبھی کبھار ہی پیدا ہوتی ہیں۔ ہمیں ان کی زندگی کو سامنے رکھ کر مسئلے کا حل تلاش کرنا چاہیے۔ اس پروگرام میں رہبر چندن، منظر صدیقی، صفوان سلفی، فردوس علی، منوج جھا، سعود انور، ہاپیت کمار سنہا، سرون کمار، سجاد احمد خاں، طارق اقبال، ابوذر، خالد حسین، محمد مجاہد، جاوید علی نشاد، محمد آصف، جہانگیر عالم، ارجن کمار، محمد اخلاق، محمد معراج، محمد زاہد وغیرہ نے بھی شرکت کی۔ (ڈاک سے)

ہم عصر اردو افسانے پر ورکشاپ

● الہ آباد، 19/اکتوبر۔ اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر، لکھنؤ کے زیرِ اہتمام بہ تعاون ادبی و ثقافتی تنظیم "قلم کار" اردو گھر میں ہم عصر اردو افسانے پر ایک ہفت روزہ ورکشاپ کا افتتاح پروفیسر سید محمد عقیل رضوی نے کیا۔ صدارت جناب شمس الرحمٰن فاروقی اور نظامت قلم کار کے کنوینر جاوید اختر نے کی۔ اس موقعے پر پروفیسر عقیل رضوی نے کہا کہ آج نئے لکھنے والے اپنے افسانوں میں زندگی کی مختلف تبدیلیوں کو بہت اچھے طریقے سے پیش کر رہے ہیں۔ ہاں! یہ ضرور

ہے کہ نئے لکھنے والوں کی زبان کھردری سی ہوگئی ہے جو ادب کے لیے صحت مند نہیں ہے۔ لہٰذا آج اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ وہ زبان پر غور وفکر کریں۔ پروفیسر عقیل رضوی نے کہا کہ ابھی تک افسانے کی تنقید پر کوئی اہم کتاب میری نظر سے نہیں گزری۔ اکثر لکھنے والے خانوں میں تقسیم ہوکر رہ گئے ہیں اور علاقائی تہذیب ومعاشرت کو ہی صرف پیش کیا ہے مگر آج کے لکھنے والے اس سے اوپر اٹھ کر عالمی سطح پر لکھنے کی کوشش کررہے ہیں، جو اچھی بات ہے۔

صدارتی کلمات میں جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے کہا کہ آج نئے لکھنے والوں کے افسانوں سے کہانی پن دور ہوتا جارہا ہے اور کچھ نقاد انھیں ایسا کرنے کی آزادی فراہم کررہے ہیں جو اردو کے لیے صحت مند نہیں ہے۔ کہانی میں نیا پن نہ ہو تو پھر کہانی لکھنے کا کیا مقصد۔ فکر وفن پر بات کرتے ہوئے فاروقی صاحب نے کہا کہ کوئی افسانہ نگار جب تک چیزوں کا تخیل نہیں کرلیتا تب تک وہ اچھا افسانہ نہیں پیش کرسکتا کیونکہ صرف تصویر پیش کرنا افسانے کا فن نہیں ہے۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ آج افسانوں میں جو زبان وبیان، لہجہ اور موضوع پیش کیا جارہا ہے اس پر ہمیں غور کرنا ہوگا۔ اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر، لکھنؤ کے پرنسپل ڈاکٹر غضنفر علی نے اپنے ادارے کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا مقصد اس سینٹر کے ذریعے اردو زبان و ادب کو فروغ دیتے ہوئے ملک میں قومی یکجہتی کو زندہ رکھنا ہے۔ ہم علی گڑھ اور الہٰ آباد جیسے شہروں میں ورکشاپ کا انعقاد کرکے غزلوں، افسانوں اور دیگر اصناف کا انتخاب کرتے ہیں جس میں دوسرے شہروں سے ادیبوں کو اس ورکشاپ میں شامل کیا جاتا ہے اور مل جل کر یہ انتخاب تیار ہوتا ہے۔ شرکت کرنے والوں میں شبنم نقوی، خورشید نقوی، ڈاکٹر اسلم الہٰ آبادی، ڈاکٹر فخر الکریم، ثروت النسا، غزال ضیغم (لکھنؤ)، احمد طارق (بریلی)، ڈاکٹر نگینہ جبیں (کانپور)، اسرار گاندھی، خواجہ جاوید اختر، ڈاکٹر صالحہ زریں، ڈاکٹر نغمہ پروین، ڈاکٹر عزیزہ بانو، حسین جیلانی، سبط حسن، شاہد ظفر، کہکشاں عرفان، کلیم الدین، عبدالقیوم شمسی، شاہ مسعود، احمد عامر اور ممتاز انور وغیرہ تھے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں توسیعی خطبہ

● نئی دہلی، 28/ اکتوبر۔ شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ممتاز ادیب اور نقاد پروفیسر قمر رئیس نے توسیعی خطبہ پیش کیا جس کا موضوع تھا "ازبکی اور اردو شاعری۔ مشترک تہذیبی اور شعری روایت"۔ پروگرام کی صدارت پروفیسر اختر الواسع نے کی۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی نے پروفیسر قمر رئیس کا خیر مقدم کیا۔ پروفیسر قمر رئیس نے ازبکستان اور ہندستان کے درمیان ادبی، تہذیبی، فنی اور جمالیاتی رشتوں کی طویل تاریخ کا جائزہ پیش کیا۔ انھوں نے علی شیر نوائی، بابر اور دوسرے شاعروں کے کلام سے مشترکہ لسانی، فنی اور جمالیاتی قدروں کی نشاندہی بھی کی۔ صدارتی خطبے میں پروفیسر اختر الواسع نے لیکچر کی ستائش کرتے ہوئے اس کی غیر معمولی افادیت پر زور دیا اور اس موضوع پر مزید خطبے پیش کرنے کی گزارش کی۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر شہپر رسول نے کی۔ جلسے میں شعبے کے اساتذہ، ریسرچ اسکالروں اور طلبہ کی بڑی تعداد موجود تھی۔ (ڈاک سے)

میکش اکبرآبادی پر مذاکرہ

● آگرہ، 20/ اکتوبر۔ "میکش اکبرآبادی سمیت آگرہ کی ادبی شخصیات پر ابھی تک اتنا تحقیقی اور تنقیدی کام نہیں ہوسکا ہے جس کے وہ حقدار ہیں۔" یہ خیالات یہاں مختلف مقررین نے میکش کے فن اور شخصیت کے سلسلے میں منعقد مذاکرے میں ظاہر کیے۔ یہ سمینار بزم میکش کے زیر اہتمام منعقد کیا گیا۔ اس موقعے پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے استاد شہاب الدین ثاقب نے میکش اکبرآبادی کو جدید اردو شاعری میں سب سے منفرد متصوفانہ شاعر قرار دیا۔ ڈاکٹر نسرین بیگم صدر شعبۂ اردو، بیلنٹھی دیوی گرلز انٹر کالج نے آگرہ کی مختصر ادبی تاریخ پر مقالہ پیش کیا۔ قبل ازیں اردو صحافت میں 100 سال پورے کرنے والے واحد اردو رسالے ماہنامہ "رہنمائے تعلیم" دہلی کے مالک و مدیر سردار ہربجن سنگھ تھاپر اور منفرد سماجی خدمات کے لیے ایس۔ این۔ میڈیکل کالج کے پرنسپل ڈاکٹر غیاث الدین قریشی کو میکش ایوارڈ دیے گئے۔ سردار تھاپر اور "رہنمائے تعلیم" کی خدمات پر اسرار اکبرآبادی نے تفصیلی روشنی ڈالی۔ میکش ایوارڈ کے تحت سردار تھاپر کو توصیف نامہ، مومنٹو، شال، چاندی کا میڈل اور 5100 روپے نقد سے نوازا گیا۔ جونیئر ہائی اسکول سے لے کر ایم۔ اے۔ تک اردو میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے والے تمام طلبہ وطالبات کو بھی انعامات دیے گئے۔ صدارت حکیم سید مرغوب الزماں نے اور نظامت نسرین بیگم وششٹی نندن نے کی۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

"فاصلاتی نظامِ تعلیم" پر مذاکرہ

● حیدرآباد، 29/ اکتوبر۔ فاصلاتی نظامِ تعلیم میں سبھوں کو حصولِ تعلیم کے یکساں مواقع حاصل ہیں۔ اس کے تحت اگر کسی یونیورسٹی کی طرف سے کوئی کورس شروع کیا جاتا ہے تو اس میں معاشی اور سماجی سطح پر مضبوط افراد کو جو سہولتیں دی جاتی ہیں وہی سہولتیں کمزور طبقے کو بھی حاصل ہوتی ہیں۔ داخلے کے لیے مقامی طلبہ اور دور دراز کے طلبہ کے ساتھ مساوی رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔ اس کورس سے ہر عمر اور طبقے کے لوگ مستفید ہوسکتے ہیں۔ کورس کی تکمیل پر ہمہ وقتی طلبہ آگے کی تعلیم یا کسی

ملازمت میں اپنی سند کو جس طرح استعمال کر سکتے ہیں اُسی طرح یہ جز وقتی طلبہ جو کسی اور معروفیت کے ساتھ کورس کی تکمیل کرتے ہیں، اپنی سند کے استعمال کا حق رکھتے ہیں۔ اس طرح فاصلاتی نظامِ تعلیم جمہوری طرز کا عکاس ہے اور یہی سبب ہے کہ اسے نہ صرف ہندستان بلکہ دنیا کے ہر خطے میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔ ان خیالات کا اظہار مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں ''فاصلاتی نظامِ تعلیم'' کے موضوع پر منعقدہ ایک خصوصی اجلاس کے ماہرین نے کیا۔ اجلاس کی صدارت فاصلاتی تعلیم کے ڈائرکٹر انچارج پروفیسر سید عبدالوہاب نے کی۔ سینٹر فار ڈسٹنس ایجوکیشن یونیورسٹی آف حیدرآباد کے ڈاکٹر پی مرلی کرشنا اور ڈائرکٹر اسٹوڈنٹس سروسیز ڈاکٹر بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی ڈاکٹر یوسباراؤ نے بالترتیب 'فاصلاتی تعلیم: مسائل اور چیلنجز' اور' اسٹڈی سینٹر مینجمنٹ'' کے موضوع پر لیکچر دیے جبکہ اردو یونیورسٹی کے پبلک ریلیشنز آفیسر انچارج ڈاکٹر محمد ظفرالدین نے ''ہندستان میں فاصلاتی نظامِ تعلیم کا منظرنامہ اور اردو یونیورسٹی'' کے موضوع پر مقالہ پیش کیا۔ اجلاس میں یونیورسٹی کے افسران کے علاوہ اسٹڈی سینٹروں کے کوآرڈینیٹرس نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ (ڈاک سے)

کرناٹک اردو اکادمی کا جلسہ

● بنگلور، 16/ اکتوبر۔ ''ہر دور میں، اس کا ادب جدید ہوتا ہے اور عصری ادب کا تقاضہ ہے کہ اس میں اپنے دور کی تشبیہات، تراکیب اور استعاروں کا استعمال ہو۔ اسی سے کوئی بھی ادب جدید یا قدیم کہلاتا ہے۔'' ان خیالات کا اظہار ممتاز ناقد جناب محمود ہاشمی نے کرناٹک اردو اکادمی کی جانب سے 14/ اکتوبر کو دارالسلام میں منعقدہ ایک ادبی اجلاس میں کیا جو دہلی سے آئے مہمانوں کے اعزاز میں منعقد کیا گیا تھا۔ جناب صلاح الدین پرویز مدیر ''استعارہ'' نے کہا کہ ان کے تخلیقی سفر میں اپنے مطالعے کے علاوہ جناب محمود ہاشمی، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور جناب محمود ایاز کی رہبری حاصل رہی۔ اس موقعے پر انھوں نے اپنا منتخب کلام بھی سنایا۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر ایچ۔ ایس۔ شیو پرکاش نے انگریزی زبان میں ''مابعد جدیدیت'' پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ'' ہمارے ملک کی ہر زبان کے ادب پر مغربی اثرات حاوی ہیں اور مغرب کے نظریات ہی کو جدیدیت یا مابعد جدیدیت سمجھا جا رہا ہے۔'' انھوں نے مابعد کی اصطلاح کو غیر موزوں قرار دیا۔ جناب شیو پرکاش نے انگریزی اور کنڑ میں اپنا کلام بھی سنایا۔ جناب زبیر رضوی مدیر'' ذہنِ جدید'' نئی دہلی نے کہا کہ ہر ادیب وشاعر کا ایک Commitment ہوتا ہے لیکن یہ وابستگی پروپیگنڈہ سے مختلف ہوتی ہے۔ زبیر رضوی نے بھی اپنی منتخب نظمیں سنائیں۔ اس موقعے پر ''نشاطِ غم'' کے شاعر جناب خلیل مامون نے بھی اپنے فن پر اظہار خیال کیا۔

جناب وہاب عندلیب نے اس ادبی اجلاس کی صدارت کی۔ مولانا شبیر احمد رکن اکادمی کی تلاوتِ کلام پاک سے اجلاس کا آغاز ہوا۔ جناب خلیل احمد، رجسٹرار نے خیر مقدم کے فرائض انجام دیے اور جناب طفسار اطہر احمد، رکنِ اکادمی نے جلسے کی نظامت کی۔ (ڈاک سے)

انجمن ترقی اردو، گلبرگہ کا جلسۂ تقسیمِ انعامات

● گلبرگہ، 14/ ستمبر۔ انجمن ترقی اردو ہند، گلبرگہ کے زیرِ اہتمام ایس۔ایس۔ ایل۔ سی۔ منعقدہ مارچ 2003 میں اردو میڈیم کے ذریعے ضلع گلبرگہ کی سطح پر نمایاں کامیابی حاصل کرنے والے طلبہ و طالبات کا جلسہ تقسیم انعامات و اسناد خواجہ بندہ نوازؒ ایوانِ اردو میں زیرِ صدارت جناب محمد عبدالعظیم (صدر انجمن) منعقد ہوا جس میں جناب قمر الاسلام، وزیر محنت حکومتِ کرناٹک، جناب اقبال احمد سرڈگی، رکنِ پارلیمان، حلقۂ گلبرگہ، زاہد علی خاں مدیر روزنامہ ''سیاست'' حیدرآباد، جناب وہاب عندلیب، صدر، کرناٹک اردو اکادمی اور اقبال احمد میئر سٹی کارپوریشن گلبرگہ کے علاوہ جناب محمد فہیم (مالک آپٹیکل پیلیس گروپ، گلبرگہ) نے بہ حیثیت مہمانانِ خصوصی شرکت فرمائی۔ اس تہنیتی اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے جناب زاہد علی خاں نے کہا کہ ملت کے نوجوانوں میں مسابقت کا جذبہ پیدا کرنا آج وقت کی اہم ضرورت ہے۔

جناب قمر الاسلام نے اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اردو مدارس کا معیارِ تعلیم بلند کرنا ہوگا تاکہ والدین یہ محسوس کریں کہ ان کا بچہ اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کرنے کے باوجود انجینیرنگ و میڈیکل کے علاوہ تمام پیشہ ورانہ نصابوں میں داخلے کا اہل ہے۔ وزیر موصوف نے اس موقعے پر اعلان کیا کہ وہ اپنی جانب سے آئندہ سال اردو میڈیم کے ذریعے ریاست گیر سطح پر اوّل آنے والے طالب علم کو-/5000 ہزار روپے کے انعام سے نوازیں گے۔

جناب اقبال احمد سرڈگی نے کہا کہ ہم چاہے کسی بھی شعبۂ زندگی سے وابستہ کیوں نہ ہوں ہمیں اردو زبان کی ترقی کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ انجمن کے زیرِ اہتمام منعقدہ اس اجلاس میں انھوں نے ادارۂ سیاست، الہدیٰ ٹرسٹ اور آپٹیکل پیلیس گروپ، گلبرگہ کی جانب سے انعامات حاصل کرنے والے طلبہ کے بارے میں کہا کہ اس طرح کی ہمت افزائی سے طلبہ و طالبات کو ضرور یہ احساس ہوگا کہ حکومت، صحافت، سیاسی قائدین اور عوام ان کے ساتھ ہیں۔

جناب وہاب عندلیب نے اس موقعے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے انعام یافتگان کو مبارکباد پیش کی اور گولڈ میڈلس اور نقد انعامات کے ذریعے طلبہ کی حوصلہ افزائی پر خوشنودی کا اظہار کرتے ہوئے جناب زاہد علی خاں کی صحافتی، سماجی و تعلیمی خدمات کو سراہا۔ اس موقعے پر جسمانی طور پر معذور طالب علم لعل محمد ولد

محبوب صاحب کو اعلا تعلیم جاری رکھنے کے لیے جناب زاہد علی خاں نے "سیاست" ملت فنڈ حیدرآباد اور جناب اقبال احمد سرڈگی نے البدر ایجوکیشنل چیریٹیبل ٹرسٹ کی جانب سے پانچ پانچ ہزار روپے کا عطیہ پیش کیا۔ علاوہ ازیں امتیازی کامیابی حاصل کرنے والے طلبہ و طالبات کو انعام سے نوازا گیا۔

انعامات کی تقسیم مہمانانِ خصوصی جناب قمرالاسلام، جناب اقبال احمد سرڈگی، جناب وہاب عندلیب، جناب اقبال احمد، جناب ایم اے عظیم اور محمد فہیم کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ جناب ولی احمد خازن نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

اردو یونیورسٹی لائبریری میں آٹومیشن خدمات کا افتتاح

● حیدرآباد، 10/اکتوبر۔ "کسی لائبریری کے قیام کے ابتدائی دنوں میں اُس کا آٹومیشن کردیا جانا بہت دوراندیشی کی بات ہے۔ لائبریریاں جیسے جیسے وسعت اختیار کرتی جاتی ہیں، ان کا آٹومیشن اتنا ہی مشکل ہوتا جاتا ہے۔ لائبریری میں آٹومیشن خدمات فراہم کرنے سے اس کے استعمال کنندگان بطور خاص محققین کے لیے کافی آسانیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔" ان خیالات کا اظہار مختلف یونیورسٹیوں کے لائبریرین حضرات نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی لائبریری میں آٹومیشن خدمات کے افتتاح کے موقعے پر کیا۔ افتتاح انچارج وائس چانسلر پروفیسر ایس.اے. وہاب کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ انھوں نے اس سلسلے میں منعقد تقریب کی صدارت بھی کی۔ صدارتی کلمات میں انھوں نے کہا کہ اردو یونیورسٹی اور اس کی لائبریری میں نئی ٹیکنالوجی کو اختیار کیا جانا ایک فطری عمل ہے کیونکہ یہ یونیورسٹی اکیسویں صدی کی یونیورسٹی ہے۔

اس موقعے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے سافٹ ویئر برائے یونیورسٹی لائبریریز کے کوآرڈینیٹر پروفیسر ایل.ایس. رمیا نے SOUL, INFLIBNET اور UGC کی جانب سے یونیورسٹی لائبریریوں کو فراہم کی جانے والی سہولتوں پر روشنی ڈالی۔ حیدرآباد سینٹرل یونیورسٹی کے لائبریرین ڈاکٹر ای. راما ریڈی نے حیدرآباد سینٹرل اور اردو یونیورسٹی کے آپسی رشتوں اور مماثلت پر اظہارِ خیال کیا۔ سی.ایف.ایل. کے لائبریرین ڈاکٹر وینکٹ رمن نے کہا کہ انتظامی افسران اور اتھارٹی کے تعاون پر لائبریریوں کی ترقی کا انحصار ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ لائبریریوں کو صرف سرکاری سافٹ ویئرس تک محدود نہیں رہنا چاہیے بلکہ عالمی میدان میں نجی سطح پر تیار کیے جانے والے سافٹ ویئر سے بھی استفادہ کرنا چاہیے۔ نظام ٹرسٹ اردو لائبریری کے سکریٹری جناب اقبال مظفر احمد نے بھی لائبریری کی ترقی کی راہ میں انتظامی رکاوٹوں پر روشنی ڈالی۔ اردو یونیورسٹی کے ڈپٹی لائبریرین اور انچارج لائبریری ڈاکٹر عباس خاں اے.اے. نے یونیورسٹی اور اس کی لائبریری کا پس منظر بیان کیا۔ (ڈاک سے)

چھٹے ادبی کوئز مقابلے کا انعقاد

● گڑگاؤں، 19/ستمبر۔ غیر اردو داں طلبہ میں اردو زبان و ادب سے دلچسپی پیدا کرنے کی مہم کے تحت ہریانہ اردو اکادمی کی جانب سے گورنمنٹ گرلز کالج گڑگاؤں میں چھٹے ادبی کوئز مقابلے کا انعقاد کیا گیا جس میں عالی جناب گوپی چند گہلوت، ڈپٹی اسپیکر، ودھان سبھا نے مہمانِ خصوصی اور ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ، ڈائرکٹر قومی اردو کونسل نے بطور صدر شرکت کی۔ اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے جناب گہلوت نے کہا کہ کالجوں میں اس طرح کے کوئزوں کے اہتمام سے طلبہ میں اردو ادب کی جانکاری بڑھے گی۔ ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ نے ادبی کوئز کے انعقاد پر اظہارِ مسرت کرتے ہوئے کہا کہ کالج سطح پر ایسے کوئزوں کا انعقاد ایک خوش آئند قدم ہے اور اسے جاری رہنا چاہیے۔ وہ بچے جو ادب سے وابستہ ہیں ان کی معلومات کے لیے یہ کوئز رحمت ثابت ہوسکتے ہیں۔

اکادمی کے سکریٹری جناب رمیندر جاکھو ساحل (آئی.اے.ایس.) نے مہمانِ خصوصی کا خیرمقدم کرتے ہوئے کہا کہ اکادمی کا پروگرام ہے کہ ادبی کوئزوں کا سلسلہ پہلے کالج اور پھر اسکولی سطح پر جاری رکھا جائے۔ انھوں نے بتایا کہ اس سے قبل پنچکولہ کے بھی تین گورنمنٹ کالجوں کے بعد انبالہ کے دونوں کالجوں میں ادبی کوئزوں کے اہتمام کے ساتھ ریاست کے دو بڑے شہروں کا احاطہ کرلیا گیا ہے اور اب اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے دوسرے شہروں کے گورنمنٹ کالجوں میں ان کا انعقاد کیا جائے گا۔

آخر میں کالج کی پرنسپل محترمہ شکلا شرما نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ ادبی کوئز کے اس مقابلے میں گورنمنٹ کالج ہی کی تینوں ٹیموں نے انعامات جیتے۔ ان میں غالب ٹیم نے اول انعام حاصل کیا جبکہ میر و اقبال ٹیموں نے بالترتیب دوسری اور تیسری پوزیشن پائی۔ اس ادبی کوئز پروگرام میں پہلی، دوسری اور تیسری پوزیشن حاصل کرنے والی ٹیموں کو بالترتیب تین ہزار، اٹھارہ سو اور بارہ سو روپے کے ساتھ تحائف اور سندیں دی گئیں۔ ٹیموں سے سوالات اکادمی کے ایڈیٹر شمس تبریزی نے کیے۔ (ڈاک سے)

غالب اکیڈمی میں جلسۂ تقسیمِ اسناد

● نئی دہلی، 15/اکتوبر۔ کمپیوٹرائزڈ کیلی گرافی ٹریننگ سینٹر غالب اکیڈمی کے تیسرے اور چوتھے بیچ کے طلبہ کو اسناد تقسیم کرنے کے لیے ایک جلسے کا اہتمام کیا گیا۔ اس جلسے میں جناب شاہد صدیقی ممبر راجیہ سبھا نے کہا کہ جدید تکنیک سے سب کا جڑنا ضروری ہے۔ جو قوم جدید ٹیکنالوجی سے نہیں جڑتی، اس کا نام و نشان مٹ جاتا ہے۔ آج کے دور میں جو زبان نئی ٹیکنالوجی اپنائے گی، وہ آگے بڑھے گی۔ جب تک ہر اردو والا کمپیوٹر کی تعلیم سے آگاہ نہیں ہوجائے تب

تک اردو کو جدید ٹیکنالوجی سے آراستہ نہیں کہہ سکتے۔

اس جلسے کی صدارتی تقریر میں لندن کے مہمان اسکالر ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب نے کہا کہ کمپیوٹر دیکھنے میں تو ایک چھوٹی سی چیز ہے لیکن اس میں دنیا کی تمام چیزیں سامنے آجاتی ہیں۔ گلوبلائزیشن سے جڑنے کے لیے آج کمپیوٹر کی تعلیم ضروری ہوگئی ہے۔ ڈاکٹر عقیل احمد نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ دور حاضر کمپیوٹر کا دور ہے۔ کمپیوٹر کی تعلیم کے بغیر آج کی تعلیم نامکمل ہے۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے پورے ملک میں سیکڑوں مراکز قائم کرکے اردو معاشرے کو کمپیوٹر سے جوڑ دیا ہے۔ ہم آج فخر سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو جدید ٹیکنالوجی سے جڑ گئی ہے۔ (ڈاک سے)

ایک شام رفعت سروش کے نام

● نئی دہلی، 24/اکتوبر۔ غالب اکیڈمی، نئی دہلی میں ایک یادگار تقریب اردو کے ممتاز شاعر اور ادیب جناب رفعت سروش کے اعزاز میں منعقد کی گئی۔ یہ تقریب انھیں حکومتِ مدھیہ پردیش کے قائم کردہ ''اقبال سمان'' دیے جانے پر اظہارِ مسرت کے لیے منعقد کی گئی تھی۔ اس موقعے پر موصوف کی تازہ ترین تصنیف ''خانوادۂ نور'' کے اجرا اور اس پر مذاکرے کا اہتمام بھی کیا گیا۔

رفعت سروش کینسر جیسی بیماری سے نبرد آزما ہوتے ہوئے اپنی روایتی خوش دلی کے ساتھ جلسہ گاہ میں آئے۔ نظامت کی ذمے داری ڈاکٹر خالد محمود نے سنبھالی۔ ابتدا میں پروفیسر ظفر احمد نظامی نے اپنی مقفّی اور مسجع نثر میں رفعت سروش کا خاکہ پڑھا۔ اس کے بعد ''خانوادۂ نور'' کا اجرا بدست پروفیسر افضل محمد (سابق وائس چانسلر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی) عمل میں آیا۔ انھوں نے ''خانوادۂ نور'' جیسی طویل نظم کہنے پر انھیں مبارکباد دی جو تہذیب انسانی بالخصوص ظہورِ اسلام کی تاریخ ہے۔ مہمان خصوصی جناب وشوبندھو گپتا نے رفعت صاحب سے اپنے دیرینہ تعلقات کا ذکر کیا۔ جلسے میں جناب فاروق ارگلی، ڈاکٹر اسلم پرویز، پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی، پروفیسر صغریٰ مہدی، پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر نثار احمد فاروقی، جناب خواجہ حسن ثانی نظامی، جناب جوگندر پال، جناب مظہر امام، ڈاکٹر کمال احمد صدیقی اور جناب متین امروہوی نے اظہار خیال کیا۔ آخر میں صدر جلسہ پروفیسر سید طاہر محمود نے رفعت صاحب کی جامع کمالات شخصیت پر روشنی ڈالی۔ عالمی اردو سماج کے سکریٹری فاروق ارگلی نے تمام مہمانوں اور سامعین کرام کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

باغپت میں آل انڈیا اردو تنظیم کا قیام

● باغپت، 10/اکتوبر۔ شہر اور ضلع کے مختلف مقامات سے آئے محبانِ اردو کا ایک اجتماع محلہ مغل پورہ میں منعقد ہوا جس میں اردو زبان کی بقا و تحفظ اور اس کو فروغ دینے کے لیے غور وخوض ہوا اور اتفاق رائے سے کل ہند سطح پر محبان اردو کو منظم کرنے کے لیے آل انڈیا اردو تنظیم کا باقاعدہ قیام عمل میں لایا گیا۔ اردو تنظیم کا صدر ظفر احمد سیفی کو بنایا گیا ہے اور 21 ارکان پر مشتمل ایک ایڈہاک کمیٹی تشکیل دی گئی ہے۔ تنظیم کا دستور مرتب کرنے کے لیے بھی ایک کمیٹی بنائی گئی ہے۔ ذرائع کے مطابق اردو تنظیم معاشرے میں اردو کی ترویج واشاعت کے ساتھ اردو تعلیم اور اسے روزگار سے جوڑنے کے لیے سیاسی اور سماجی سطح پر بھرپور جدوجہد کرے گی اور اردو کو سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر نظر انداز کیے جانے کی مزاحمت کرتے ہوئے اردو کو واجب قانونی حق دلانے کی تحریک چلائے گی۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

پروین شاکر کی شاعری پر مباحثہ

● گورکھپور، 6/اکتوبر۔ راز سوشل کمیٹی کے تحت پروین شاکر کی شاعری پر مباحثہ احساس مکہری کی صدارت میں ہوا۔ اس مباحثے میں راز اعظمی، کومل شریواستو، نازش رضوی اور زیبا غازی پوری نے شرکت کی۔ احساس مکہری نے کہا کہ اگرچہ روایت سے بغاوت آسان کام نہیں تھا، پھر بھی ہندوپاک میں کچھ خواتین نے جرأت مندانہ قدم اٹھایا۔ ان میں پاکستانی شاعرہ پروین شاکر شامل ہیں۔ راز اعظمی نے کہا کہ پروین شاکر کی شاعری کی روشنی اتنی تیزی سے چمکی کہ آنکھیں حیران سی رہ گئیں۔ کومل شریواستو نے پروین شاکر کو ایک کہنہ مشق شاعرہ قرار دیا۔ نازش رضوی نے کہا کہ پروین شاکر کا انداز بیاں دیدنی ہے۔ زیبا غازی پوری نے کہا کہ پروین شاکر کی نظموں میں ڈرامے جیسی اٹھان نظر آتی ہے۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کا اردو کنونشن

● نئی دہلی، 11/اکتوبر۔ اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کی جانب سے دہلی سطح پر اردو کنونشن منعقد ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر ایس۔آئی۔ خاں نے کی جبکہ نظامت کے فرائض یو۔آر۔ قاسمی نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی وسیم احمد غازی نے اس موقعے پر کہا کہ زندہ قومیں مراعات کی منتظر نہیں رہتیں بلکہ اپنی محنت اور جدوجہد سے اپنی منزل پانے کا حوصلہ رکھتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت ضرورت ہے کہ ہم باہمی اشتراک سے اردو کے بدن میں ایک نئی روح پھونک کر اسے مقبولِ عام بنائیں۔ ہمیں غور کرنا چاہیے کہ آخر ہم سے کہاں غلطی ہوئی ہے۔

ڈاکٹر ایس۔آئی۔ خاں نے کہا کہ اردو کی بقا و تحفظ کے لیے سرکار سے امداد مانگنے کے بجائے ہمیں خود میدان میں آنا ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ ہر شخص ذاتی سطح پر اتنا ضرور کرسکتا ہے کہ اپنے محلوں اور علاقوں میں دکانداروں اور ڈاکٹروں وغیرہ سے کہے کہ وہ کم از کم سائن بورڈوں میں اردو کا استعمال کریں۔ کنونشن میں مرتضیٰ حسین، حسین اشتیاق، ڈاکٹر سلیم اور وضاحت حسین عالم نے بھی خطاب کیا۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

پروفیسر عبدالمغنی انجمن ترقی اردو بہار کے صدر منتخب

● پٹنہ، 20/اکتوبر۔ پروفیسر عبدالمغنی کو ساتویں مرتبہ انجمن ترقی اردو بہار کا صدر چن لیا گیا ہے۔ یہ انتخاب چھپرہ میں مجلسِ عام کے اجلاسِ انتخاب میں ہوا، جس کی صدارت ڈاکٹر آر. ارشد نے کی۔ یہ انتخاب بلا مقابلہ ہوا۔ مجلسِ عام نے پروفیسر عبدالمغنی کو نئی مجلسِ عاملہ کی تشکیل اور ضوابط میں ضروری اصلاحات تجویز کرنے کا اختیار بھی دیا۔ مجلسِ عاملہ نے جناب عبدالقیوم انصاری کو جنرل سکریٹری منتخب کیا۔ یہ انتخاب بھی بلا مقابلہ ہوا۔ (ڈاک سے)

● پٹنہ، 27/اکتوبر۔ انجمن ترقی اردو بہار کے صدر پروفیسر عبدالمغنی نے جنرل سکریٹری جناب عبدالقیوم انصاری کے علاوہ نئی مجلسِ عاملہ کے حسب ذیل عہدیداروں اور ارکان کے ناموں کا اعلان کر دیا ہے۔

صدر— پروفیسر عبدالمغنی، **نائب صدور**— جناب ہارون رشید، جناب جمیل احمد ایڈووکیٹ، پروفیسر ایم.او صدیقی، ڈاکٹر آر. اسری ارشد، جناب فخرالدین عارفی، **جنرل سکریٹری**— جناب عبدالقیوم انصاری، **خازن**— ڈاکٹر شکیب ایاز، **سکریٹریز**— ڈاکٹر اسرائیل رضا، ڈاکٹر نجیب اختر، جناب سید احمد قادری، **ارکان**— جناب انیس الرحمان، پروفیسر سید شفیع احمد، پروفیسر مظفر اقبال، ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی، مولانا امانی ندوی، جناب احمد اشفاق کریم، جناب انوار الحسن وسطوی، پروفیسر سہیل احمد، **مدعوئین**— ڈاکٹر شبیر احمد، جناب اکرام الحق، جناب اظہار الحق صدیقی، ڈاکٹر محمد شمیم، جناب جمیل اختر محیا، ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، پروفیسر مناظر احسن، پروفیسر کمال الدین، جناب ظفر احمد غنی، جناب محمد منظور حسن، جناب معین شاہد، جناب انعام الحق صدیقی۔ ڈویژنل آرگنائزر— جناب رسول اختر (پھلا)، جناب فضل وارث (مگدھ)، پروفیسر احترام الیقین (ترہت)، ڈاکٹر حبیب مرشد خاں (بھاگل پور)، جناب شمیم ربانی (پورنیہ)۔ (ڈاک سے)

رمیش مہتا جموں وکشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگو یجز کے نئے سکریٹری

● سرینگر، 24/ستمبر۔ جموں وکشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز کے نئے سکریٹری کے طور پر شری رمیش مہتا نے ذمے داریاں سنبھال لی ہیں۔ انھوں نے شری بلونت ٹھاکر کی جگہ لی ہے۔

شری مہتا نے اس موقعے پر اپنے عزم وارادے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ ریاست جموں وکشمیر میں آرٹ اور کلچر کے فروغ کے لیے بھرپور کوشش کریں گے اور اس کے لیے مؤثر اقدامات کریں گے۔ (ڈاک سے)

انعامات واعزازات

مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکادمی کے انعامات

● ممبئی۔ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی نے سال 2002 کے انعامات کا اعلان کر دیا ہے، جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

سنت گیانیشور ایوارڈ۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، -/51000 روپے، ولی دکنی قومی ایوارڈ۔ مغنی تبسم، -/30000 روپے، سراج اورنگ آبادی ریاستی ایوارڈ۔ ڈاکٹر میمونہ دلوی، -/25000، سیتو مادھوراؤ پگڑی ایوارڈ (برائے اردو مراٹھی خدمات)۔ بھیم راؤ پانچالے، -/15000، ساحر لدھیانوی ایوارڈ (برائے نئی ادبی صلاحیت): تنویر غازی، -/10000، ہارون رشید صحافتی ایوارڈ۔ توفیق مرزا، روزنامہ تہلکہ ٹائمس، ناندیڑ -/5000، شمشاد احمد، روزنامہ ہندوستان، ممبئی، -/5000، شفاعت اللہ خاں، روزنامہ، امراوتی، -/5000، تزئین کاری ایوارڈ۔ اتش، سہ ماہی ''نیا ورق'' ممبئی، -/5000، شاعری کے لیے: امان اختر مرحوم، بسمل اعظمی، نعیم اختر، محشر منظری— کہانی، ناول، ڈرامہ اور ترجمہ کے لیے: اسلم پرویز، غلام نبی مومن، رام پرکاش سکسینہ، محترمہ نیر شبنم۔ تنقید تحقیق اور تاریخ کے لیے: ڈاکٹر فصیح احمد صدیقی، ڈاکٹر شرف الدین ساحل، جاوید جمال الدین۔ بچوں کے ادب کے لیے: رفیق گلاب، ڈاکٹر ایم.آئی. ساجد، عبدالعزیز عرفان۔ تعلیمی وملی خدمات کے لیے: اسداللہ خاں، عبدالرشید صدیقی اور ڈاکٹر محمد یوسف انصاری، کو فی کس پانچ ہزار روپے کے انعام کا حقدار قرار دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ 26 اساتذہ کو فی کس ایک ہزار روپے کا انعام دینے کا بھی اعلان کیا گیا ہے۔ (ڈاک سے)

آٹھواں عالمی فروغ اردو ادب اور چھٹا سلیم جعفری انٹرنیشنل ایوارڈ

● قطر۔ قطر کی ادبی تنظیم مجلس فروغ اردو ادب کے زیر اہتمام بین الاقوامی مشاعرہ بیاد جون ایلیا، آٹھویں عالمی فروغ اردو ادب اور چھٹے سلیم جعفری انٹرنیشنل ایوارڈ کی تقریبات کا انعقاد 25/ستمبر کو مختلف ممالک کے سربراہان، قطری عمائدین، ہندوپاک سے تعلق رکھنے والے تجارتی اداروں کے سربراہان، مقامی سماجی شخصیات اور تقریباً دو ہزار حاضرین کی موجودگی میں قطر کے سابق وزیر اطلاعات ڈاکٹر احمد عبدالعزیز الکواری نے مجلس فروغ اردو ادب ادیب وشاعر ایوارڈ صلاح الدین پرویز اور پاکستانی ناول نگار مستنصر حسین تارڑ کو ڈیڑھ ڈیڑھ لاکھ روپے اور سونے کے تمغوں پر مشتمل آٹھواں عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ اور روسی ادیبہ نتالیا پریگارینا کو 75 ہزار روپے اور گولڈ میڈل پر مشتمل چھٹا سلیم جعفری انٹرنیشنل ایوارڈ پیش کیا۔ (سیاست جدید کانپور)

اردو اکادمی دہلی کا جلسۂ تقسیمِ انعامات

● نئی دہلی، 23/اکتوبر۔ اردو اکادمی، دہلی کے جلسۂ تقسیمِ وظائف و انعامات میں تقریر کرتے ہوئے اکادمی کے وائس چیئرمین جناب م. افضل نے کہا کہ جب تک ہم اردو کو اپنی روزمرّہ کی زندگی میں شامل نہیں کرتے، اس کی ترقی ناممکن ہے۔ صرف سرکاری مراعات ملنے اور سرکار سے مطالبات کرنے سے اس زبان کا بھلا ہونا ممکن نہیں ہے۔

جلسے کی صدارت اردو اکادمی کے رکن اور انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم نے کی اور اکادمی کے سکریٹری مرغوب حیدر عابدی نے شکریہ ادا کیا۔

اکادمی ہر سال درجہ چہارم سے ایم. اے. تک کے ان ہونہار طلبہ کو وظائف و انعامات دیتی ہے جنھوں نے اردو مضمون کے ساتھ اپنے درجات میں اوّل، دوم اور سوم مقام حاصل کیا ہو۔ یہ جلسہ تقسیمِ وظائف صرف درجہ چہارم اور درجہ پنجم کے طلبہ کے لیے منعقد کیا گیا تھا۔ اس میں تقریباً 80 اسکولوں کے 128 طلبہ میں ایک لاکھ دو ہزار چار سو روپے نقد تقسیم کیے گئے۔ اس کے علاوہ سند اور اکادمی کا مومنٹو بھی دیا گیا۔ بقیہ درجات کے جو تقسیمِ انعامات وظائف کے جلسے منعقد کیے جائیں گے ان میں تقریباً پانچ لاکھ روپے نقد تقسیم کیے جائیں گے۔ اردو اکادمی، دہلی کے اس جلسہ تقسیمِ وظائف میں بڑی تعداد میں اسکولوں کے پرنسپل حضرات، اساتذہ اور والدین نے شرکت کی۔ اس موقعے پر اردو اکادمی کی گورننگ کونسل کے معزز اراکین پروفیسر ظفر احمد نظامی، ڈاکٹر علی جاوید، ڈاکٹر عقیل احمد، ڈاکٹر احرار حسین، جناب اظہار عثمانی، جناب نرل سنگھ نرل اور جناب محمد یوسف نے بھی شامل ہو کر طلبہ کی حوصلہ افزائی کی۔ جلسے کی نظامت جناب انیس احسن اعظمی نے کی۔ (ڈاک سے)

مختصرات

● جمشید پور کے فعال ادبی ادارے "اردو قبیلہ" کے زیر اہتمام کریم سٹی کالج میں ہر سال کی طرح اس سال بھی ادبی پروگرام "ایک شام منظر کاظمی کے نام" منعقد ہوا جس میں مہمانِ خصوصی جناب صفدر رضی پرنسپل ورکرس کالج اور مہمانِ اعزازی روزنامہ "ہندستان" جمشید پور کے شری چندر تھے۔ جلسے کی صدارت عزیز حسین صاحب (سابق ڈی. جی. ایم TELCO) نے کی۔ ڈاکٹر محمد زکریا اور ڈاکٹر افسر کاظمی صدر "اردو قبیلہ" نے منظر کاظمی سے متعلق چند اہم واقعات پر روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر 2003 کا منظر کاظمی ایوارڈ کلکتہ یونیورسٹی کی صدر شعبۂ اردو محترمہ ڈاکٹر شہناز نبی کو دیا گیا۔ آخر میں صدر ادارہ افسر کاظمی نے تمام حاضرین اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

● لندن، 24/ستمبر۔ پانچ بین الاقوامی ججوں کے فیصلے کے مطابق امسال احمد ادار یہ ایوارڈ موصول شدہ نثری تخلیقات (افسانوں کے مجموعے) میں سے برطانیہ کے مقصود الٰہی شیخ کی تخلیق "من درپن" کو دیا گیا ہے۔ انٹرنیشنل ججوں کے پینل انٹرنیشنل ادارہ کمیٹی اور ادارہ اردو مرکز انٹرنیشنل، لاس اینجلز نے مقصود الٰہی شیخ کو مبارکباد دی ہے۔ احمد ادار یہ ایوارڈ جو کہ شیلڈ اور پانچ ہزار ڈالر پر مشتمل ہے، 18/اکتوبر کو مومن لاج کمیونٹی ہال میں منعقدہ انٹرنیشنل مشاعرے میں دیا گیا۔ (ڈاک سے)

● ممبئی۔ فلم، ٹیلی ویژن اور جرنلزم کے ایوارڈز کے لیے مشہور ممبئی کی ادبی، تہذیبی اور ثقافتی تنظیم "آشیرواد" نے سال 2002-03 کے لیے ملک کی سترہ زبانوں کے صحافیوں کے ساتھ اردو میں صحافتی خدمات کے لیے نوجوان صحافی اور شاعر فرحان حنیف کو "ڈاکٹر ہری ونش رائے بچن ایوارڈ" سے نوازا۔ 26/ستمبر کو ورسوا (ممبئی) میں منعقدہ ایک تقریب کے دوران مشہور پروڈیوسر ڈائرکٹر ساون کمار ٹاک اور مہاراشٹر ودھان سبھا کے اسپیکر ارون گجراتی نے فرحان حنیف کو ایوارڈ کی رقم، شال، ناریل اور مومنٹو پیش کر کے حوصلہ افزائی کی۔ اس موقعے پر ٹیلی ویژن کے مشہور اداکار مکیش کھنہ اور موسیقار رویندر جین بھی موجود تھے۔
(ڈاک سے)

● بھنڈارہ، 17/اکتوبر۔ جی. ایم پٹیل کالج، بھنڈارہ کے شعبۂ اردو کی جانب سے کالج کے نائب پرنسپل جناب او. پی. مشرا کی صدارت میں پہلی مرتبہ ایک ادبی نشست منعقد کی گئی۔ ایل. اے. ڈی کالج کی صدر شعبۂ فارسی ڈاکٹر قمر جہاں نے اپنا مقالہ "کرشن چندر کی افسانہ نگاری" اور ایک افسانہ "سورج اور ستارہ" سنایا۔ طالبات نے اپنی تخلیقات پیش کیں۔ معروف انشائیہ نگار ڈاکٹر محمد اسد اللہ نے انشائیہ "خدا بچائے بن بلائے مہمانوں سے" پیش کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر راج بہٹ اور پروفیسر مینا کشی جوشی نے بھی اظہار خیال کیا۔ جلسے کی نظامت کے فرائض صدر شعبۂ اردو محترمہ افروز قریشی نے انجام دیے اور شکریہ پروفیسر ریاض الرحمٰن نے ادا کیا۔ (ڈاک سے)

● ممبئی، 18/اکتوبر۔ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی، غزل ساگر پرتشٹھان (ممبئی) اور مسلم ایجوکیشن سوسائٹی (داپولی) ضلع رتناگیری کے زیرِ اہتمام نیشنل ہائی اسکول داپولی میں کوکن کے نامور شاعر بدیع الزماں خاور کی یاد میں ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس میں خاور مرحوم کی مراٹھی کلیات کا اجرا بیگم امتیاز بدیع الزماں خاور کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ بدیع الزماں خاور کے فن اور شخصیت اور تراجم کی اہمیت پر سلام بن رزاق، یعقوب راہی، ڈاکٹر رام پنڈت، وقار قادری اور خالد آرائی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس تقریب میں جسونت جالگانوکر مہمانِ خصوصی تھے اور عمر عبداللہ دلوی نے صدارت کی، بعد ازاں بھیم راؤ پانچالے نے خاور اور دیگر شعرا کی غزلیں پیش کیں۔ دتابال صراف نے نظامت

کے فرائض انجام دیے۔ (ڈاک سے)

● حکومتِ مہاراشٹر کی جانب سے پونہ ضلع میں صرف تین اداروں کو ''اقلیتی تعلیمی ادارے'' کا درجہ اور منظوری حاصل ہوئی ہے۔ جس میں سے ایک ''اردو کونسل پیپری چنچوڑ'' اور بقیہ دو انگلش (کرسچین) ادارے ہیں۔ اس تاریخی فیصلے سے اب حکومت کی فراہم کردہ وہ تمام تعلیمی سہولتیں ادارے کو حاصل ہوں گی جو اقلیتوں کو آئین کی دفعات 29 اور 30(i) کے تحت حاصل ہیں۔ (ڈاک سے)

شعر و افسانہ کی محفلیں

● ممبئی، 27 ستمبر۔ ''نئی صدی میں جس طرح کے اچھوتے اور زندگی سے قریب محسوس ہونے والے افسانے لکھے جا رہے ہیں اور افسانہ نگار جس طرح کا ادب تخلیق کر رہے ہیں۔ اس سے محسوس ہو رہا ہے کہ نئی صدی میں افسانہ اپنی اہمیت کو منوا رہا ہے۔'' ان خیالات کا اظہار صابو صدیق پولی ٹیکنک ممبئی میں ادارہ ادبِ اسلامی کے زیرِ اہتمام منعقدہ محفلِ افسانہ میں مہمانِ خصوصی ڈاکٹر سید عبدالباری نے کیا۔ اس محفلِ افسانہ میں مظہر سلیم نے موجودہ دور میں مسلمانوں کی صورتِ حال پر مبنی اپنا افسانہ ''جڑیں'' پیش کیا۔ مقصود اظہر کا افسانہ ''پانی کی ایک بوند'' زندگی کے تضادات پر مبنی تھا۔ نور الحسن نے ''بیساکھیوں پر کھڑے لوگ''، معین الدین عثمانی نے ''نجات کے بعد''، بشیر ہاشمی نے ''آئینے بانٹنے والا''، ای سین نے ''وراثت'' کے عنوان سے افسانے پیش کیے۔ عظیم راہی نے بھی اپنا افسانہ سامعین کو سنایا۔ پروگرام کا افتتاح کنوینر جاوید ندیم نے کیا۔ صدارت یوسف ناظم نے کی اور پروگرام کی نظامت اصغر حسین قریشی نے کی۔ جاوید ندیم کے شکریے کے ساتھ پروگرام ختم ہوا۔ (ڈاک سے)

● نئی دہلی، 23 اکتوبر۔ اردو پریس کلب اور ستیہ سائی انٹرنیشنل سینٹر کے اشتراک سے انسانی اقدار اور بین مذاہب ہم آہنگی کے فروغ کے لیے ایک مشاعرہ اور کوی سمیلن منعقد کیا گیا جس میں سابق وزرائے اعظم پی وی نرسمہا راؤ اور وشوناتھ پرتاپ سنگھ بحیثیت مہمانِ خصوصی موجود تھے۔ جس میں وی. پی. سنگھ نے اپنی نظموں سے سامعین کو محظوظ کیا۔ مشاعرے کی صدارت اردو پریس کلب کے چیئرمین اور پارلیمانی رکن عبدالرشید شاہین نے کی۔ دیگر معزز مہمانوں میں دلی کے لیفٹیننٹ گورنر وجے کپور، پارلیمانی رکن سعید الزماں، اتر پردیش کے سابق وزیر نسیم الدین صدیقی اور ارشاد مرزا کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ نظامت کے فرائض مہدی جعفری نے ادا کیے۔ ستیہ سائی انٹرنیشنل سینٹر کے ڈائرکٹر لیفٹیننٹ جنرل ڈاکٹر ایم. ایل. چھبر نے استقبالیہ تقریر کی۔ اردو پریس کلب کے جنرل سکریٹری محمد طارق فیضی نے اظہارِ تشکر کیا۔

اس مشاعرے میں شری وی. پی. سنگھ، جناب فرحت احساس، جناب سلیم شیرازی، جناب پیغام آفاقی، جناب احمد محفوظ، جناب طالب رامپوری، محترمہ عفت زریں، جناب طارق متین، جناب معین شاداب، جناب مہیش منظر، محترمہ نوری پروین اور محترمہ سویتا اسیم نے کلام سنایا۔ اس موقعے پر جن کویوں نے اپنا کلام پیش کیا ان میں مہاراج کرشن کاو، اَل اسیم، انامیکا شری واستو، دھنی رام نونیت ہریش یادو، نوکانت ٹھاکر، گنگا پرساد ول وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

● دہلی، 26 اکتوبر۔ دہلی کی فعال ادبی تنظیم ''ادبیاتِ عالیہ اکادمی'' کے زیرِ اہتمام E-93 ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی میں لسان العصر اکبر الٰہ آبادی کی یاد میں زیرِ صدارت ابوالمجاہد زاہد ایک ادبی و شعری محفل منعقد ہوئی۔ محفل کا آغاز اجمل فاروق کی نعت سے ہوا اور ادبیاتِ عالیہ اکادمی کے جنرل سکریٹری خالد ولایت عمری نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ ڈاکٹر تابش مہدی نے اپنی افتتاحی گفتگو میں کہا کہ اکبر الٰہ آبادی اپنی طرز کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی۔ بیسویں صدی کے نصفِ آخر کے اہم شاعر اکبرِ ثانی علامہ شہباز امروہوی کے علاوہ کسی میں بھی اس روایت کو اپنانے کا حوصلہ نہیں ہوا، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اکبر الٰہ آبادی کی طرف ہمارے ناقدین بہت کم توجہ کر رہے ہیں۔ ریسرچ اسکالر نسیم مجیدی نے ''اکبر الٰہ آبادی کی معنویت'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ اس کے بعد اکبر الٰہ آبادی کے درج ذیل دو مصرعوں پر ممتاز شاعر و نقیب مشاعرہ جناب ماجد دیوبندی کی نظامت میں شاندار مشاعرہ ہوا:

اللہ کی مرضی سب کچھ ہے بندے کی تمنا کچھ بھی نہیں
وہ تھا اک خواب جو بھولا ہوا ہے

مشاعرے میں جن شعرا نے حصہ لیا، ان کے نام یہ ہیں: ابوالمجاہد زاہد، نجم مظفر نگری، قاضی ابرار کرت پوری، ماجد دیوبندی، رفیق احمد سلفی، ڈاکٹر تابش مہدی، عبدالعزیز یاس چاند پوری، ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی، حسنین سائر، امین صدیقی، وقار کیفی اور تنویر آفاقی۔

رسمِ اجرا

''زمین لاپتہ رہی''

● سرینگر۔ پچھلے دنوں ممتاز شاعر ڈاکٹر حنیف ترین کی سرینگر (کشمیر) آمد پر اُن کے اعزاز میں جموں و کشمیر کلچرل اکادمی نے ایک محفل آراستہ کی جس میں ڈاکٹر حنیف ترین کے تازہ شعری مجموعے ''زمین لاپتہ رہی'' کی رونمائی انجام دی گئی اور ان کے فن اور شخصیت پر مقالے پڑھے گئے۔ تقریب کا آغاز جموں و کشمیر کلچرل اکادمی کے سکریٹری جناب بلونت ٹھاکر کے استقبالیہ خطبے سے ہوا۔ اس کے بعد اکادمی کے شعبۂ اردو کے ایڈیٹر جناب محمد اشرف ٹاک نے ڈاکٹر

حنیف ترین کا سوانحی خاکہ پیش کیا۔ ڈاکٹر حنیف ترین نے تقریباً نصف درجن شعری مجموعے تصنیف کیے ہیں۔ آپ برّصغیر ہندو پاک سے باہر خصوصاً عرب ممالک میں اردو کو مقبول بنانے کے لیے گذشتہ دو دہائیوں سے بھرپور کوششیں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی کوششوں کی بدولت سعودی عرب کے منطقے حدود الشمالیہ کے مشہور شہر عرعر میں وقتاً فوقتاً اردو کی ادبی محفلیں اور مشاعرے منعقد ہوتے رہتے ہیں۔

کشمیر کے مایہ ناز شاعر و ناقد اور ادیب جناب فاروق نازکی نے ''زمین لاپتہ رہی'' پر ایک مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے حنیف ترین کے کشمیر کے ساتھ دیرینہ اور گہرے رشتوں کے حوالے سے اُن کی شاعری کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی۔

کشمیر کے معروف نثر نگار، محقق اور براڈ کاسٹر جناب بشیر شاہ نے ڈاکٹر حنیف ترین کی شاعری کی مختلف خصوصیات اجاگر کیں۔ بعد ازاں جناب صوفی غلام محمد (چیف ایڈیٹر ''سرینگر ٹائمز'') اور جناب رحمان راہی (مشہور کشمیری شاعر، محقق اور تنقید نگار) نے بھی مذاکرے میں حصہ لیا۔ تقریب میں سرکردہ ادیبوں، قلم کاروں، فنکاروں، صحافیوں اور دانشوروں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ (ڈاک سے)

''غنچہ پھر لگا کھلنے''

● نئی دہلی، 13 راکتوبر۔ علیمہ سعدیہ شگفتہ کے شعری مجموعے ''غنچہ پھر لگا کھلنے'' کا اجرا جناب سید حامد، چانسلر، جامعہ ہمدرد کے ہاتھوں عمل میں آیا جس کا انعقاد القورویمنس ویلفیر آرگنائزیشن کے زیرِ اہتمام اردو اکادمی کے اشتراک سے غالب اکادمی بستی نظام الدین میں ہوا۔ پروگرام کی نظامت کے فرائض معین شاداب نے انجام دیے۔ اس کے بعد ''غنچہ پھر لگا کھلنے'' پر منظوم تبصرہ ڈاکٹر عبدالستار طرزی نے پیش کیا۔ اس موقعے پر مہمانِ خصوصی کے طور پر عزیز برنی ایڈیٹر راشٹریہ سہارا، اسد رضا اور م. افضل وائس چیئرمین اردو اکادمی بھی موجود تھے۔ جلسے میں حقانی القاسمی مدیر ''استعارہ''، شہلا نواب مدیر ''محفلِ صنم'' اور ترنم ریاض نے بھی خطاب کیا۔ (ڈاک سے)

''خیمۂ گل''

● ارریہ، 22 رستمبر۔ خلیل میموریل لائبریری کے احاطہ میں ادارہ ''ہم سب'' کی جانب سے مہمانِ خصوصی اور اردو ادب کے معروف ادیب و نقاد ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی شعبۂ اردو، بھاگل پور یونیورسٹی کے ہاتھوں بزرگ شاعر مظہر القیوم مظہر کے اوّلین شعری مجموعے ''خیمۂ گل'' کا اجرا عمل میں آیا۔ جلسے کی صدارت شمس جمال اور ڈاکٹر ایس. آر. جھا نے کی۔ بعد ازاں ایک مذاکرے کا اہتمام کیا گیا۔ شمس جلیلی ایڈووکیٹ کی صدارت اور افسانہ نگار رفیع حیدر انجم کی نظامت میں پارا بیگم، تسنیم کوثر اور ثروت گلنار کے علاوہ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، شمس جمال، ڈاکٹر ایس آر جھا، نہرو کالج بہادر گنج کے سابق پرنسپل پروفیسر محمد حنیف، پورنیہ کالج کے سابق صدر شعبۂ اردو، پروفیسر طارق جمیلی، ادارہ ''ہم سب'' کے جنرل سکریٹری رضی احمد تنہا، ہندی ادیب و شاعر رہبان علی راکیش نے اپنے مقالوں میں ''خیمۂ گل'' کی شاعرانہ عظمت اور مظہر القیوم مظہر کی علمی خدمات کا اعتراف کیا۔ (ڈاک سے)

''میں رونا چاہتا ہوں''

● نئی دہلی، 22 راکتوبر۔ جواں فکر شاعر فرحت اللہ خاں فرحت احساس کے شعری مجموعے ''میں رونا چاہتا ہوں'' کی رسمِ رونمائی سابق وزیر اعظم جناب پی وی نرسمہا راؤ کے ہاتھوں انجام پائی۔ ڈاکٹر لین گول مارکیٹ نئی دہلی میں منعقد تقریب رونمائی کی صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شیخ الجامعہ جناب سید شاہد مہدی نے کی۔ سید شاہد مہدی نے فرحت احساس کی شاعری پر روشنی ڈالتے ہوئے انھیں عہدِ حاضر کا روشن فکر و روشن ضمیر شاعر قرار دیا۔ پروفیسر اختر الواسع اور عبید صدیقی نے بھی اس موقعے پر اظہارِ خیال کیا۔ مجلسِ تہنیت میں مسٹر کشور لال سابق رکن پارلیمنٹ موہن چراغی، جاوید حبیب، پیغام آفاقی، مجیب الدین خاں اور راحت محمود چودھری (کنوینر) کے نام شامل ہیں۔ (قومی آواز، دہلی)

''اور مٹھو اُڑ گیا''

● فتح پور، 18 رستمبر۔ بزم شمیم، فتح پور کے زیرِ اہتمام ممتاز افسانہ نگار تسکین زیدی کی تازہ تصنیف بچوں کی کہانیوں کا مجموعہ ''اور مٹھو اُڑ گیا'' کا اجرا محمد معین الدین ایڈووکیٹ نے کیا۔ صدارت بزرگ شاعر وحید متین نے کی۔ اس ادبی تقریب میں مقامی ادبا و شعرا کے علاوہ پروفیسر ابوالحسنات حقی نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔

تسکین زیدی کا تعارف بزم نیاز کے جنرل سکریٹری قمر صدیقی نے پیش کیا۔ اس کے بعد تسکین زیدی نے اپنی کہانی ''آئینہ'' سنائی۔ نظیر سلطانی نے تسکین زیدی کی کہانی پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ان کے اسلوب کو سراہا۔ ڈاکٹر گوہر مسعود نے ''تسکین زیدی کی افسانہ نگاری'' ڈاکٹر جمال احمد نے ''تسکین زیدی کے افسانوں میں دھنک رنگ'' ادارۂ ہم سخن کے جنرل سکریٹری ظفر اقبال ظفر نے ''ادبِ اطفال اور تسکین زیدی'' کے زیرِ عنوان تسکین زیدی کے فکر و فن کا جائزہ لیا۔ پرنسپل اندر سروپ سریواستو نے تسکین زیدی کی تحریر کردہ بچوں کی کہانیوں پر جامع تقریر کی۔ اس کے بعد پروفیسر ابوالحسنات حقی نے تسکین زیدی کی بچوں کی کہانیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ تسکین زیدی نے اپنے افسانوی ادب کے ذریعے ادب میں اپنی الگ شناخت بنائی ہے۔ آخر میں تسکین

زیدی نے بانیانِ محفل کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

ماہنامہ "شاندار"

● نئی دہلی، 19/اکتوبر۔ نیشنل اردو فورم، نئی دہلی کے زیر اہتمام اردو کے معروف شاعر نیاز جیراجپوری کی ادارت میں شائع ہونے والے ادبی، فلمی، سیاسی رسالے "شاندار" اعظم گڑھ کے افتتاحی شمارے کا اجرا بیسویں صدی کی امتیازی مدیرہ ڈاکٹر شمع افروز زیدی کے ہاتھوں ہوا۔ صدر جلسہ پروفیسر خالد محمود نے "شاندار" جیسے رسالے کی ضرورت، اہمیت اور افادیت پر بھرپور روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر ابرار رحمانی، ڈاکٹر کوثر مظہری، ڈاکٹر مشتاق صدف، ڈاکٹر مولا بخش، جناب حقانی القاسمی، انور زنبہت، عمران عظیم، شعیب رضا وارثی، ابرار احمد ایڈووکیٹ، ڈاکٹر فرہاد آزر، ریاض احمد، ضمیر منظر، نادر رضوی اور شفیع اللہ وغیرہ نے بھی اظہار خیال کیا۔ (ڈاک سے)

جانے والوں کی یاد

ڈاکٹر ظہیر ناصر

● نئی دہلی، 23/اکتوبر۔ معروف فلم جرنلسٹ ڈاکٹر ظہیر ناصر کا 57 برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون) اہل خاندان کی اطلاع کے مطابق علی الصباح ان کو سانس لینے میں دقت محسوس ہوئی اور پھر چند منٹوں میں ہی حالت تشویشناک ہوگئی۔ ڈاکٹر کو بلایا گیا، لیکن ان کی روح پرواز کر چکی تھی۔ مرحوم ظہیر ناصر کو فلمی صحافت میں سند کا درجہ حاصل تھا۔ وہ کئی مشہور رسائل سے وابستہ رہے۔ خصوصاً ماہنامہ 'شمع' میں ان کی تحریر کردہ 'مسافر کی ڈائری' کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ مرحوم اپنے مخلصانہ طور طریقوں کی وجہ سے حلقۂ احباب میں کافی پسند کیے جاتے تھے۔ مرحوم کی تدفین حضرت خواجہ باقی باللہ کی درگاہ میں ہوئی۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

م.ک. مہتاب

● نئی دہلی، 12/نومبر۔ اردو کے ممتاز افسانہ نگار اور شہرہ آفاق کہانی "سرسوں کے پھول" کے خالق م.ک. مہتاب 5/نومبر کو انتقال ہوگیا۔ وہ ایک عرصے سے بستر علالت پر تھے۔ وہ 72 برس کے تھے۔ پسماندگان میں ایک بیٹی اور دو بیٹے ہیں۔ پریس انفارمیشن بیورو کے سابق انفارمیشن افسر منوہر لال کپور جن کا قلمی نام م.ک. مہتاب تھا کے انتقال سے اردو ادب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ وہ وشیشر پردیپ اور رام لعل جیسے فنکاروں کے ساتھ اردو کی آبیاری کرنے والوں میں ایک اہم نام تھے۔ م.ک. مہتاب نے افسانوں کے علاوہ کافی تعداد میں مضامین بھی لکھے اور ہندو پاک کے اہم رسائل و جرائد میں ان کی ایک نمایاں پہچان تھی۔ دوران ملازمت وہ آل انڈیا ریڈیو کے نیوز ایڈیٹر بھی رہے اور سری نگر ریڈیو کی ذمے داریاں بھی سنبھالیں۔ انھوں نے اردو اکیڈمی گورنمنٹ کونسل کے رکن کے طور پر بھی اپنی خدمات سے اردو کو فیض پہنچایا۔

(قومی آواز، دہلی)

ساجد بزمی

● راجستھان کے بزرگ کہنہ مشق شاعر جناب زین الساجدین بزمی کا، جو ساجد بزمی کے نام سے معروف تھے، ان کے آبائی وطن ٹونک میں انتقال ہوگیا۔ وہ لمبے عرصے سے بیمار تھے اور چلنے پھرنے سے معذور ہوگئے تھے۔

ساجد بزمی کا تعلق ایک ایسے دیندار گھرانے سے تھا جسے علم و ادب سے بھی گہرا شغف تھا۔ خود بزمی صاحب اردو کے نغز گو شاعر ہونے کے علاوہ فارسی زبان و ادب پر مکمل عبور رکھتے تھے اور انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے لیے کئی اہم فارسی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ بزمی صاحب یوں تو کئی اصناف سخن پر قدرت رکھتے تھے لیکن غزل ان کا خاص میدان تھا۔ غزل کے روایتی تقاضوں کو پوری طرح ملحوظ رکھتے ہوئے غزل کے اشعار میں اپنے دل کی دھڑکنوں کو سمو دینا ان کا خاص فن تھا۔ انھوں نے کئی نوآموزوں کے ذہن و ذوق کی تربیت بھی کی۔ افسوس یہ ہے کہ ان کی زندگی میں ان کا کوئی مجموعۂ کلام شائع نہیں ہوا اور اس میں زمانے کی قدرناشناسی سے زیادہ خود ان کے تساہل اور بے نیازی کو دخل رہا۔ اب ان کے بعد اگر یہ کار خیر انجام دیا جاسکے تو یہ ایک بڑی ادبی خدمت ہوگی۔ اس طرف راجستھان اردو اکادمی کو بھی توجہ کرنی چاہیے جس نے گزشتہ سال انھیں اپنا سب سے بڑا ایوارڈ جو پروفیسر محمود خاں شیرانی سے منسوب ہے، پیش کیا تھا۔ (ڈاک سے)

جوابات کوئز:

1-ج	2-ج	3-الف	4-ب	5-الف	6-د
7-د	8-ج	9-الف	10-ج	11-ج	12-د
13-ب	14-الف	15-ب	16-الف	17-ج	18-الف
19-ب	20-ب	21-ج	22-ب	23-الف	24-ج
25-ب	26-ب	27-الف	28-د	29-ج	30-ج
31-د	32-د	33-ج	34-ب	35-ج	36-ب
37-ج	38-د	39-ج	40-ج	41-ب	42-ب
43-د	44-ج	45-د	46-ب	47-ج	48-ب
49-د	50-د	51-ب	52-ب		

تبصرہ و تعارف

انیس کے سلام / علی جواد زیدی
صفحات:- 307، قیمت:- /60 روپیے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر.کے. پورم، نئی دہلی
مبصر: احمد کفیل

سلام کی صنف نے مرثیے کی آغوش میں جنم لیا۔ سلام کے ابتدائی نقوش تو عربی اور فارسی شاعری میں مل جاتے ہیں لیکن ایک جداگانہ صنف کے طور پر یہ صرف اردو میں ہی پھلی پھولی۔ ہیئت کے اعتبار سے غزل، سہرا اور سلام کو شئے واحد تصور کیا جاتا ہے۔ غزل کے تشکیلی مزاج میں عشق اور سلام کے تشکیلی مزاج میں اعتقاد کو بالادستی حاصل ہے۔ یہ وہ اعتقاد ہے جس میں اخلاقی، منقبتی، رثائی، مدحیہ اور بھکتی جیسے موضوعات شامل ہوتے ہیں۔ سلام کی اصلی شناخت اس کے اندرونی آہنگ سے ہوتی ہے۔ سلام میں غزل کی طرح اعلا درجے کے مضامین وارداتِ قلبیہ اور معاملاتِ ذہنیہ باندھے جاتے ہیں۔

اردو میں شمالی ہند میں سلام کی ابتدا محمد شاہ رنگیلے کے عہد سے ہوئی۔ ابتدائی دور کے سلاموں میں ایک اعتقادی فضا چھائی ہوئی تھی جس کا مقصد سرکار رسالت میں نذرانۂ عقیدت واحترام پیش کرنا یا پھر امام سے اظہار عقیدت اور سوگواروں سے اظہار تعزیت کرنا ہوتا تھا۔ اس دور کے سلام نویسوں میں مسکین، فضلی، خادم دہلوی، جاں فشاں دہلوی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ بعد میں ولی، شاکر ناجی، مصطفےٰ خاں یک رنگ نے سلام گوئی کو فروغ دیا۔ سلام گوئی کا ابتدائی رنگ میر وسودا کے زمانے تک قائم رہا۔ اسی دور میں میر انیس کے پردادا میر غلام حسین ضاحک تھے جن کے کلیات میں سلاموں کا سب سے بڑا مجموعہ ملتا ہے۔ متقدمین نے مثلث، مربع اور ترکیب بند کی ہیئتوں میں بھی سلام لکھے ہیں لیکن میر ضاحک سے لے کر مصحفی ورنگین کا دور وہ ہے جس نے سلام نویسی کے لیے غزل کی ہیئت مقرر کردی اور دھیرے دھیرے اس صنف میں ادبی عناصر کی آمیزش ہونے لگی۔ معاملاتِ ذہنیہ اور وارداتِ قلبیہ کا ادبی اظہار سلاموں میں کیا جانے لگا۔ ضمیر، فصیح، دلگیر اور خلیق نے اس صنف کو مزید آگے بڑھایا اور روایتی سلام میں ہی اپنا معتبر لہجہ قائم کیا۔ دبیر نے بھی خاص تعداد میں سلام کہے مگر انھیں خالص رثائی سلام کے زمرے میں ہی رکھا جاتا ہے۔ یہی صنف جب انیس و مونس تک پہنچی تو اس کے اندر ایک جدید ادبی لب ولہجہ قائم ہوگیا۔

ایک موضوعاتی صنفِ سخن کی حیثیت سے انیس نے سلام کو ترقی کی راہ دکھائی۔ انھوں نے سلام میں منقبتی اور اخلاقی مضامین کو ہلکے متغزلانہ طرز میں ادا کرنے کی بنیاد ڈالی لیکن انھوں نے رثائی سانچے کو سرے سے ترک بھی نہیں کیا۔

انیس نے اپنے سلاموں میں رثائی موضوعات کے علاوہ جن مضامین کو جگہ دی ہے ان میں اپنے ذاتی مسائل، اپنے ذہنی ارتقا، زمانے کی ناقدری، معاصرین کا حسد، نقالوں، خوشہ چینوں، مضمون وزدوں، فنی لوازمات اور بلند خیالی جیسے مضامین شامل ہیں۔ مضامین کی اس فہرست پر نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ سلام کا خمیر جمالیاتی احساس، توازن، خلوص، دردمندی، بلند بینی، معیار پسندی اور اخلاق دوستی سے عبارت ہے۔ نمونے کے لیے میر انیس کے ایک ہی سلام کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

سدا ہے فکرِ ترقی بلند بینوں کو
ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو
یہ جھرّیاں نہیں ہاتھوں پہ ضعفِ پیری نے
چنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو
کہاں تھا حر، کدھر آیا، یہ بختِ یاور تھا
نثار شہ پہ ہوا مار کر لعینوں کو
علم لیے ہوئے عباس نکلے خیمے سے
چڑھا لیا علی اکبر نے آستینوں کو
لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو
غلط یہ لفظ، وہ بندش بری، یہ مضموں سست
ہنر عجیب ملا ہے یہ نکتہ چینوں کو
بشر کو چاہیے دنیا میں اس کے حسن سے عشق
کہ جس نے خلق میں پیدا کیا حسینوں کو
خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

اس طرح دیکھا جائے تو انیس کے سلام میں ایسے اشعار ہوتے ہیں جو غزلوں میں کھپ سکتے ہیں۔ لیکن ان کا رثائی اور اخلاقی آہنگ انھیں غزلوں سے الگ کرتا ہے۔ اس طرح مراثی انیس میں جس طور پر ہم اردو شاعری کے بالیدہ ذہن وتخیل کا مطالعہ کرتے ہیں، اسی طرح ان کے سلام بھی بالیدہ ذہن اور وسیع و عریض آزاد فضا کی مختلف نیرنگیوں سے واقفیت کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔

انیس کے سلاموں کے مجموعے اس سے پہلے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ''ذخیرۂ ثواب'' اور ''شمع تعزیت'' کو شائع ہوئے لگ بھگ سو برس ہو رہے ہیں۔ اس کے علاوہ مراثی انیس کی مطبوعہ جلدوں میں بھی ان کے سلام شائع ہوتے رہے ہیں۔ سید صغیر حسن نے ''گلدستۂ انیس'' کے نام سے انیس کے سلاموں کو مرتب کیا۔ پاکستان سے ''تجلیاتِ انیس'' کے نام سے انیس کے سلاموں کا مجموعہ خاندانِ انیس کے ہی ایک فرد سید یوسف حسین شائق نے شائع کیا۔ اس کے باوجود انیس کے سلاموں کے جتنے مجموعے اب تک شائع ہوئے ہیں ان میں ''انیس کے سلام'' پہلا جامع مجموعہ ہے جس میں انیس کے تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ سلام شامل کر لیے گئے ہیں۔ ان میں سلاموں کی تعداد 102 ہے۔ ان میں تحت اللفظ چوالیس اور سوز کے انھاون ہیں۔ نوحے چودہ، تضمین تین اور مناجات و منقبت ایک ایک ہیں۔ حواشی کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسے مرتب کرنے میں مطابقت کا کام ہر ممکن احتیاط سے کیا گیا ہے۔ بہت سی جگہوں پر اغلاط کی تکرار ہوتی چلی آ رہی تھی، ان کی نشان دہی بھی علی جواد زیدی نے کر دی ہے۔ ریاست محمود آباد کے کتب خانے میں انیس کے سلاموں کا ایک نادر مجموعہ ہے اسی کے مندرجات زیرِ تبصرہ مجموعے کی بنیاد ہیں۔ یہ نسخہ غالباً سید محمد عباس آصف نبیرۂ میر انیس کا مرتب کیا ہوا خاندانِ انیس کے ذخیروں پر مبنی ہے۔ علی جواد زیدی نے انیس کے سلاموں کے شائع شدہ دیگر مجموعوں کے علاوہ ''خانوادۂ انیس کے نوحے'' (مطبوعہ کراچی) اور ''مراثی انیس'' جلد پنجم (بک لینڈ، کراچی) سے بھی استفادہ کیا ہے جن میں انیس کے سلام موجود ہیں۔

•

ہندستان کے زمانۂ قدیم و وسطیٰ کے کتب خانے

مصنف: بمل کمار دت/مترجم: سرتاج احمد عابدی

صفحات: 241، قیمت: 69/- روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی

مبصر: محمد سلیم الدین ندوی

عہد قدیم اور عہد وسطیٰ کے ہندستان میں لائبریری کو علم و دانش کا سرچشمہ سمجھا جاتا تھا۔ اسی لیے بادشاہوں، امرا اور جاگیرداروں نے اپنے اپنے ذاتی کتب خانے قائم کیے، نیز مذہبی اداروں اور خانقاہوں میں بھی کتب خانے قائم کیے گئے۔ اس کے باوجود اُس زمانے میں کتب خانے بہت کم تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت کتب خانے زیادہ تر شاہی درباروں یا مذہبی علما کے حلقوں تک ہی محدود تھے۔ انھی کتب خانوں کی بدولت ہمیں بڑی تعداد میں مخطوطات حاصل ہوئے جو ہمارا قیمتی اثاثہ ہیں۔ اس دور کے کتب خانوں کی باقاعدہ تاریخ جو کہ ملک کے ذہنی ارتقا کا ایک ضروری باب کہی جا سکتی ہے زیرِ نظر کتاب سے قبل کسی نے نہیں لکھی تھی۔

زیرِ تبصرہ کتاب کی تصنیف کا خیال مصنف کے ذہن میں اس وقت آیا جب وہ کولمبیا یونیورسٹی، نیویارک میں اسکول آف لائبریری سائنس کے طالب علم تھے بقولِ مصنف ''وہاں کے نصاب میں کتابوں اور تہذیب کے فروغ پر ایک پرچہ بھی ہے لیکن اس میں ہندستان نے جو کارنامے انجام دیے ہیں، ان کا ذکر شامل نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندستان کے کتب خانوں کے ارتقا پر کوئی کتاب ہی موجود نہ تھی۔ جس کی وجہ سے واپس وطن آیا تو برابر یہ قصد رہا کہ قدیم زمانے سے دورِ طباعت کے آغاز تک کے ہندستان کے کتب خانوں کی مکمل تاریخ کا ایک جائزہ پیش کروں۔''

یہ کتاب درحقیقت مصنف کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر انھیں کلکتہ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری مل چکی ہے۔ کتاب میں ہندستان کے زمانۂ قدیم اور عہد وسطیٰ کے کتب خانوں اور فنِ کتب داری کے فروغ کی ایک باضابطہ اور جامع تاریخ بیان کی گئی ہے۔ کتاب میں سامانِ کتابت، مخطوطات اور کتابوں کی جلد سازی، نظامِ کتب خانہ، کتابوں کی درجہ بندی، کیٹلاگ سازی اور کتابوں کی حفاظت سے متعلق ابواب شامل کیے گئے ہیں۔ پہلے باب میں قدیم خاندانوں اور دیگر اداروں سے وابستہ لائبریریوں کا ذکر ہے جس میں شاہی کتب خانے اور دانش گاہوں کی لائبریریاں بھی شامل ہیں اور ملک کے تعلیمی پس منظر کا مختصر خاکہ بھی ہے۔ دوسرے باب میں چین گیان بھنڈار کا جو مغربی ہندستان میں تھے اور سرسوتی بھنڈار کا جو جنوبی ہند میں تھے بیان ہے۔ تیسرے باب میں دہلی سلطنت کی شاہی اور اہم ذاتی لائبریری کی تاریخ اور سماجی و تعلیمی سرگرمیوں کی تفصیل ہے۔ چوتھے باب میں عہدِ مغلیہ کی شاہی اور اہم ذاتی لائبریریوں کا ذکر ہے۔ جس میں اُس دور کے ہند و مراکز اور کتب خانے بھی آ گئے ہیں، ساتھ ہی دکنی سلاطین اور مراٹھوں کے کتب خانوں کا بھی بیان ہے۔ اگلے باب میں جنوبی ہند اور بنگال کے عیسائی تبلیغی مراکز کی تعلیمی سرگرمیوں کی تفصیل ہے۔ باب ششم میں سامانِ تحریر مثلاً کاغذ وغیرہ کی ایجاد و ابتدا کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ اگلے دو ابواب میں کتابوں کی تشکیل، جلد سازی اور مخطوطات اور کتابوں کی تصویر کشی سے بحث کی گئی ہے، نواں باب نظامِ علمِ کتب خانہ اور کتابوں کی درجہ بندی کے بارے میں ہے اور دسویں اور آخری باب میں ہندستان میں چھاپہ خانہ کی کہانی کو مکمل کرتے ہوئے اس جائزے کو تمام کیا گیا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف موضوع سے متعلق پوری تفصیل فراہم کرتی ہے بلکہ ہندستان کی تہذیبی تاریخ کے ایک اہم پہلو پر مکمل روشنی بھی ڈالتی ہے۔

اصل کتاب انگریزی زبان میں لکھی گئی تھی جس کا ترجمہ سرتاج احمد عابدی نے پوری محنت اور لگن سے کیا ہے۔ ترجمہ سلیس اور آسان زبان میں کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ہر بات کو مکمل اور پوری طرح واضح کیا گیا ہے۔ کتاب انگریزی اور

اردو دونوں میں کافی مقبول ہو چکی ہے۔ اور یہ اس کی مقبولیت ہی ہے کہ قومی اردو کونسل نے اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا ہے۔

•

اردو شاعری: انتخاب/ ڈاکٹر خورشید عالم، ڈاکٹر وسیم بیگم
صفحات:-259، قیمت:-/54روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر.کے. پورم، نئی دہلی
مبصر: پرویز احمد اعظمی

شاعری، وفورِ جذبات کے بے اختیار بہہ نکلنے کا نام بھی ہے اور نغمۂ الہام بھی۔ فکر و آگہی عطا کرنے اور شعور کو جلا بخشنے کے ساتھ ہی ساتھ اس کا کام تفریحِ طبع بہم پہنچانا بھی ہے۔ اسے زندگی کی تنقید اور حالات کی روشن تفسیر بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں انسانی زندگی کے تجربات و مشاہدات بھی شامل ہوتے ہیں جن سے اذہان کو جلا ملتی ہے۔ یہ ذہنوں کو پروان چڑھانے کے علاوہ سوتوں کو جگاتی اور جاگتوں کو دعوتِ عمل بھی دیتی ہے۔ اس کا کام محض کانوں میں رس گھولنا نہیں بلکہ ذوقِ سلیم کو ایک خوش گوار کیفیت بھی عطا کرنا ہے۔ اس کے لیے ردیف و قافیہ کی پابندی ضروری نہیں مگر ان سے ایک طرح کی موسیقیت اور خوش آہنگی پیدا ہوتی ہے، جس سے اثر آفرینی میں اضافہ ہوتا ہے۔

ان باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اگر زیرِ تبصرہ کتاب پر نگاہ ڈالی جائے تو اسے ایک موزوں انتخاب (طلبہ کی ضروریات کو دیکھتے ہوئے) کہا جائے گا۔ غزلوں اور نظموں کے انتخاب کو دو حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ غزلوں کے انتخاب سے قبل غزل کی تعریف، اس کی ابتدا و ارتقا اور دیگر فنی لوازم سے بحث کی گئی ہے۔ اسی طرح نظموں کے انتخاب سے پہلے نظم کی تعریف، اس کی ابتدا اور ارتقا، پابند نظم، معریٰ اور آزاد نظم کے فرق کے ساتھ ان کی تعریف بھی درج کر دی گئی ہے۔ اس سے طلبہ کو جدید نظم کی مختلف اقسام کا فرق سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

شعرا کی غزلوں کے انتخاب سے پہلے ان کا اجمالی تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔ غزلوں کا انتخاب درد، میر، آتش اور غالب سے لے کر فیض، ناصر کاظمی، خلیل الرحمٰن اعظمی، مظہر امام اور مخمور سعیدی تک 17 اہم شعرا کی تخلیقات سے کیا گیا ہے۔ اس انتخاب میں کلاسیکی شعرا کے ساتھ ساتھ جدید عہد کے شعرا کی غزلوں کی شمولیت نے اس کی اہمیت بڑھا دی ہے۔ تقریباً دو صدیوں کو محیط اس پورے عہد میں غزل کی ہیئت میں تو کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی لیکن مواد ضرور سماجی و سیاسی تحریکوں سے متاثر ہوا۔ غزلوں ہی کی طرح نظموں کا انتخاب بھی اقبال، جگر، مخدوم، فیض سے شہریار، ندا فاضلی، فہمیدہ ریاض وغیرہ تک، گیارہ شعرا کی تخلیقات سے کیا گیا ہے۔ رباعی کے تحت صرف فراق کی رباعیوں کو جگہ دی گئی ہے۔

چونکہ یہ کتاب فاصلاتی تعلیم کے طالب علموں کے لیے تیار کی گئی ہے، لہٰذا ان کی ضرورتوں کے مدِنظر ان کی سہولت کے لیے دائیں صفحے پر مشکل الفاظ کے معنی دیوناگری رسمِ خط میں تحریر کیے گئے ہیں۔ دیوناگری میں یقیناً انھیں آسانی ہوگی لیکن جب طلبہ غزلوں اور نظموں کو پڑھ سکتے ہیں تو کیا اردو میں درج کیے گئے معنوں کو وہ سمجھنے سے قاصر رہتے؟ بہرحال کتاب اوّل تا آخر پڑھنے کے بعد قاری اردو شاعروں اور ان کی تخلیقات ہی سے واقف نہیں ہوگا بلکہ اردو ادب میں ان کے مقام کے بارے میں بھی اپنی ایک رائے قائم کرنے میں کامیاب ہو سکے گا۔ مختلف اداروں کی طرف سے چلائے جانے والے اردو زبان کے فاصلاتی کورس کے نصاب میں یہ انتخاب شامل کیا جا سکتا ہے۔

•

دی وار جرنلس/ صلاح الدین پرویز
صفحات:191، قیمت:-/200روپے
ناشر: مکتبہ استعارہ، 248، غفار اپارٹمنٹس، غفار منزل ایکسٹنشن، استعارہ لین، جامعہ نگر، نئی دہلی-110025
مبصر: فیروز عالم

صلاح الدین پرویز کا شمار دورِ حاضر کے اہم ادیبوں میں ہوتا ہے۔ ''نمرتا''، ''ایک دن بیت گیا''، ''سارے دن کا تھکا ہوا پُرش'' اور ''آئیڈنٹٹی کارڈ'' کے بعد ان کا نیا ناول ''دی وار جرنلس'' حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ اس ناول میں انھوں نے اپنے مخصوص علامتی انداز میں امنِ عالم کو درپیش خطرات کو موضوع بنایا ہے اور قارئین سے گزارش کی ہے کہ وہ ساری دنیا میں امن و امان کے قیام کے لیے دعا کریں اور بلا امتیازِ مذہب و ملّت اور رنگ و نسل ان معصوم بے گناہوں کی یاد میں ایک پَل کی خاموشی اختیار کریں جو مر چکے ہیں، مر رہے ہیں یا مرنے والے ہیں۔

اس ناول کی تکمیل مصنف نے 18 دنوں میں کی ہے اور پورا ناول بھی 18 ادھیائے (ابواب) میں منقسم ہے۔ غور طلب ہے کہ گیتا بھی 18 ابواب پر مشتمل ہے اور مہابھارت کی جنگ بھی 18 دن ہی چلی تھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس فیصلہ کن جنگ کے خاتمے پر خیر کو شر پر فتح حاصل ہوئی تھی لیکن عہدِ حاضر کا یہ مہابھارت ہنوز جاری ہے اور یہ کہنا بڑا مشکل ہے کہ اس جنگ میں فتح کس کی ہوگی۔

ناول کا تانا بانا عراق، افغانستان اور پاکستان کے ساتھ ساتھ ہندستان میں رونما ہونے والے مختلف واقعات و حادثات سے بُنا گیا ہے۔ عصرِ حاضر کی مختلف سیاسی شخصیات مثلاً جارج ڈبلیو بُش، ٹونی بلیئر، پرویز مشرف، صدام حسین، اسامہ بن لادن اور ملا عمر کو ناول میں کردار کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ناول کا پلاٹ چار قسم کے موضوعات سے مزین ہے، مثلاً موجودہ عہد کے اہم واقعات پر صحافتی رپورٹیں، ناول نگار کا شعری کلام، تاریخ عراق کے مختلف حصے

اور مہابھارت کے اٹھارہ ابواب سے اقتباسات۔

ناول میں گیارہ ستمبر کو ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر کیے جانے والے دہشت گردانہ حملے کے ساتھ ساتھ 13 دسمبر 2001 کو ہندستان کی پارلیمنٹ پر ہوئے حملے کو بھی موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ لیکن ناول نگار نے 13 دسمبر کی بجائے 7 اکتوبر 2002 لکھا ہے (صفحہ -57) جو سہو کاتب معلوم ہوتا ہے، اسی طرح صفحہ 72 پر ''تاخت وتاراج'' کی بجائے ''تخت وتاراج'' شائع ہوگیا ہے۔ ناول نگار نے کانگا اور صدام حسین میں مماثلت دکھانے کی کوشش کی ہے لیکن اس میں وہ زیادہ کامیاب نہیں رہے ہیں۔

مختصر یہ کہ ''دی وار جرنلس'' میں ناول نگار کی تمام تر توجہ امنِ عالم پر مرکوز رہی ہے یہی وجہ ہے کہ ناول کا اختتام ایک واضح پیغام پر ہوا ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ انسان اور انسانیت کو شہید کرنے کی اجازت کسی کو نہیں۔

●

گل دستہ (حصہ اوّل تا چہارم) / پروفیسر مرزا محمد زماں آزردہ

صفحات: فی حصہ 32، قیمت: فی حصہ -/25 روپے

ناشر: مرزا پبلی کیشنز، حسن آباد، رعناواری، سرینگر، کشمیر

مبصر: کلیم اللہ

ماں کی گود بچے کی پہلی درس گاہ ہوتی ہے اور اس کی تربیت کا زیادہ تر دارومدار اس کی ماں اور اس کے خاندانی افراد پر ہے۔ لیکن اس ابتدائی درس گاہ سے جب وہ باہر قدم رکھتا ہے تو اس کی تعلیم وتعلم کے لیے کتابیں سامنے آتی ہیں جو خاندان کے افراد کے مانند ہی اس کی ذہنی تربیت میں اہم حصہ لیتی ہیں۔ لہٰذا جس طرح بچوں کی عمدہ تربیت کے لیے صحت مند اور پُرمسرت خاندانی ماحول کی اشد ضرورت ہوتی ہے اسی طرح صحیح اور متوازن خطوط پر لکھی گئی کتابوں کی بھی۔ پروفیسر مرزا محمد زماں آزردہ نے اپنی چار کتابوں کی یہ سیریز جو بعنوان ''گل دستہ'' (حصہ اوّل تا چہارم جو پہلی بار جنوری 1990 اور دوسری بار ستمبر 2003 میں شائع ہوئی)، خصوصی طور پر ان کم سن بچوں کی اخلاقی، روحانی اور معاشرتی تربیت کے لیے تیار کی ہے جو خود ان کے الفاظ میں ''اپنے والدین سے عمر رسیدہ ہیں۔'' کتابیں عنوانات کا احاطہ کرتی ہیں، کتابوں کے موضوعات کا انتخاب بچوں کے مزاج، ان کی دلچسپی اور رجحان کو مدِنظر رکھ کر کیا گیا ہے اور ہر ایک موضوع کے مطابق سادہ اور عام زبان کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ کتابوں کے مطالعے کے دوران واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی ذہنی کاوشوں کو بچوں کے مزاج اور استعداد کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی ہے تاکہ ان کی بات جو دل سے نکلی ہے دل تک پہنچ جائے۔ بات کی توضیح کے لیے براہین ودلائل کے طور پر فطری مناظر، معاشرتی رسوم، انسانی اقدار، تاریخی حقائق، سائنسی ایجادات اور کتب کے قصائص وغیرہ کا برمحل استعمال کیا گیا ہے اور جہاں جہاں مشکل الفاظ کا استعمال ناگزیر تھا وہاں ان مشکل الفاظ کے معانی حاشیے میں دے دینے سے اس سیریز کی معنویت دوچند ہوگئی ہے۔ کتابوں کو پڑھے بغیر محض تبصرے کی بنیاد پر کوئی رائے قائم کرنا مناسب نہیں ہوتا۔ لیکن اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اس سیریز کی کتابوں کے عنوانات، تصاویر، کمپوزنگ اور طباعت بچوں کو اس بات کے لیے ضرور اکسائے گی کہ وہ ان کا مطالعہ کریں جس سے ان کے ذہن کی کھڑکیاں کھلیں گی اور وہ اس معاشرے کے آداب سے واقف ہوسکیں گے جس میں وہ قدم رکھنے والے ہیں اور اس معاشرے سے کماحقہ، واقفیت ہی کی بنا پر وہ اپنے مستقبل کے خوابوں کی تعبیر کرسکتے ہیں۔

●

عرفان عباسی۔ حیات وخدمات / عبدالحنان سبحانی ندوی

صفحات: 207، قیمت: -/150 روپے

ملنے کا پتہ: مکتبہ ندویہ، ندوۃ العلما، لکھنؤ

انجمن ترقی اردو ہند، راؤز ایونیو، نئی دہلی

زیرِ نظر کتاب تذکرہ شعرائے اتر پردیش (جو کئی جلدوں میں شائع ہوئی۔) کے مصنف عرفان عباسی کے احوال وکوائف کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کے پہلے باب میں عرفان عباسی کے حالاتِ زندگی اور ان کے تخلیقی کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں تذکرہ نگاری کی اہمیت، روایت اور عرفان عباسی کی تذکرہ نگاری، باب سوم میں موصوف کو حاصل ہونے والے انعامات واعزازات، باب چہارم میں ان کے متعلق مختلف مشاہیر کی آرا، باب پنجم میں ان کو لکھے گئے خطوط اور باب ششم میں ان کے افرادِ خانہ کے تاثرات نقل کیے گئے ہیں۔

●

سید حرمت الاکرام حیات وخدمات / ڈاکٹر ایس۔ جی۔ آئی۔ حیدر

صفحات: 237، قیمت: -/200 روپے

ملنے کا پتہ: 6، ڈی، محمن بریئل گراؤنڈ لین، کولکاتا-23

یہ کتاب ڈاکٹر ایس۔ جی۔ آئی۔ حیدر کا تحقیقی مقالہ ہے جس کے ذریعے انھوں نے ایک غیر معروف شاعر سید حرمت الاکرام کی حیات وخدمات سے متعارف کرایا ہے۔ سات ابواب پر مشتمل اس کتاب میں بنگال میں اردو شاعری کی روایت، سید حرمت الاکرام کے عہد کی سیاسی وسماجی صورت حال، موصوف کی نجی زندگی، ان کے معاصرین، ان کی ادبی خدمات اور بحیثیت شاعر سید حرمت الاکرام کے مقام کا جائزہ لیا گیا ہے۔

□□□

تحریر: ایرا سکینہ
ترجمہ: عارف نقوی

بچوں کا گوشہ

زندگی کو سمجھنے اور اسے بہتر بنانے میں اچھا ادب معاون ہوتا ہے اور ساتھ ہی اپنے پڑھنے والوں کو یہ ذہنی تفریح بھی بہم پہنچاتا ہے۔ بڑوں کی طرح بچوں کا بھی یہ حق ہے کہ ان کی ذہنی ضرورتوں کے مطابق انہیں اچھا ادب فراہم کیا جائے جو سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہو تاکہ بچے خوشی خوشی اس کا مطالعہ کریں۔ کونسل نے چلڈرن بک ٹرسٹ کے اشتراک سے بچوں کے لیے بڑی تعداد میں ایسی کتابیں شائع کی ہیں جو اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔

ذیل میں قومی اردو کونسل کی شائع کردہ کتاب "24مختصر کہانیاں" سے ایک کہانی پیش کی جارہی ہے۔ اس کتاب میں شامل کہانیاں دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ بچوں کی معلومات میں بھی اضافہ کرتی ہیں۔ چند کہانیوں کے عنوانات یہ ہیں۔ نیلی موٹر سائیکل، پڑوسی، انوکھے پودے، ہمت جیت کا راز، بھوندو بُدھو، شکاری، چھوٹی سی بھول، ننھی گوریا، ماں کا تحفہ وغیرہ۔ 184 صفحات کی اس کتاب کی قیمت صرف 40روپے ہے۔

انسانی روبوٹ

''سُپر روبوٹ پلازا'' کے چمکتے جھل مِل کرتے نیون سائن کو دیکھ کر پریم چوپڑا کے ہونٹوں پر ایک شیطانی مسکراہٹ آگئی۔ اُس نے ٹریفک سے بھری سڑک پار کر کے اُس اسٹور کی طرف بڑھتے ہوئے سوچا، اب میں اپنا ایک 'گُرگا' خرید سکتا ہوں۔ لوٹی ہوئی رقم کو اس سے زیادہ فائدے کے کام میں نہیں لگایا جاسکتا۔ سُپر روبوٹ اپنے الکٹرونک فنکشن اور قاعدے سے کام کرنے کے معاملے میں بہت مشہور ہیں اور واقعی وہ ہیں بھی اچھے۔

''میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں جناب۔'' سُپر روبوٹ پلازا میں گئے سے چندھی آنکھوں والے ایک آدمی نے دانت نکال کر مصنوعی ہنسی کے ساتھ کہا۔

''وہ.....'' پریم چوپڑا گھبرا گیا۔ اُس نے ٹویڈ کے کوٹ کی جیب سے رومال نکال کر ماتھے پر آئے پسینے کے قطروں کو پونچھا، ٹائی کی گرہ درست کی اور ایک بار پھر اپنے اندر کچھ اعتماد پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ایک روبوٹ خریدنا چاہتا ہوں.....''

''اپنی مدد کے لیے جناب!؟'' سیلز مین نے اُس کا جملہ پورا کردیا۔ ''یہی تو ہماری خصوصیت ہے۔ ہم بہت کارآمد روبوٹ تیار کرتے ہیں۔ فیکٹریوں کے لیے، مکان بنانے والی کمپنیوں کے لیے، صفائی کا کام، نلوں کی مرمت یا کسی بھی کام کی دیکھ بھال کرنے والے۔ کسی بھی خاص کام کے لیے یہ روبوٹ ڈیزائن کیے جاتے ہیں۔ ہمارے سب سے اچھے روبوٹ، آپ جیسے گاہکوں

کے لیے ہی ہیں، گھر کا کام کرنے والے روبوٹ۔'' وہ ایسے بول رہا تھا جیسے رکارڈ کیا ہوا کوئی پروگرام سنایا جا رہا ہو۔

''جی ہاں مجھے ایسا ہی چاہیے۔'' پریم چوپڑا نے کاروباری انداز میں کہا۔

''ادھر آیئے جناب۔'' سیلز مین تیز روشنی والی گیلری کی طرف بڑھا جس میں بہت قیمتی قالین بچھا تھا۔ گیلری سے گزر کر وہ ایک گنبد نما ہال میں پہنچے جو فلوریسینٹ لائٹوں سے جگمگا رہا تھا۔ سیدھے ہاتھ کے کونے میں لگتا تھا جیسے ہرے نیلے اور چاندی کے رنگ کے روبوٹ کی بھیڑ جمع ہو۔ کچھ ایسے چل رہے تھے جیسے ابھی چلنے کی مشق کر رہے ہوں لیکن کچھ بالکل ساکت کھڑے تھے۔ جیسے اُن کا سوئچ بند کر دیا گیا ہو۔ جیسے ہی پریم چوپڑا نے ہال کے دروازے میں قدم رکھا، ایک روبوٹ تیزی سے آگے آیا ''گڈ ڈے سر! سپر روبوٹ پلازا میں آپ کا سواگت ہے۔ امید ہے آپ کا یہاں تشریف لانا کارآمد ثابت ہوگا۔'' چاندی کے رنگ کا روبوٹ مشینی آواز میں بولا۔

''کمال ہے۔'' پریم چوپڑا ہکا بکا ہو کر منہ ہی میں بُدبُدایا۔

سیلز مین فخر سے مسکراتا ہوا ایک نیلے رنگ کے روبوٹ کی طرف بڑھا۔ جو الگ تھلگ کھڑا تھا۔ ''یہ روبوٹ گھر کا کام کرنے کے لیے بہت کمال کے ساتھ پروگرام کیا گیا ہے۔ صفائی ستھرائی، بازار سے سودا لانا، لان کی گھاس کاٹنا، خط ڈاک میں ڈالنا، T.V. پر آپ کے پسند کے پروگرام لگانا، اخبار میں سے آپ کے پسند کی خبریں چننا۔'' سیلز مین سانس لینے کے لیے ذرا سا رُکا اور پھر شروع ہو گیا' آپ جو کچھ چاہیں بس صرف ایک ریموٹ کنٹرول کی مدد سے اسے ہدایت دے سکتے ہیں۔''

''آپ کا مطلب ہے گھر پر بیٹھ کر میں اُسے شہر کے بازار میں ہدایت دے سکتا ہوں۔'' پریم چوپڑا نے پوچھا۔

''یہ والا روبوٹ آدھے کلومیٹر ریڈیئس (قطر) کی حد میں کام کر سکتا ہے، ویسے اُس کا نام رام سنگھ 070 ہے'' سیلز مین نے سمجھایا۔

پریم چوپڑا نے سر ہلایا۔ سیلز مین نے روبوٹ کی رفتار، پکڑ اور مختلف حرکتوں اور کچھ دوسرے کاموں، فنکشنز کو جو اُس میں پروگرام کیے گئے تھے، ایک بار پھر آزمایا۔ ہر چیز بالکل ٹھیک ٹھاک اور اپنی جگہ تھی۔

''میں اسے لوں گا۔'' پریم چوپڑا نے فیصلہ کر لیا۔

''ضرور جناب۔'' سیلز مین نے سر جھکا کر کہا'' آپ میرے ساتھ دفتر میں تشریف لے چلیں تو میں آپ کو اُس کے..... میرا مطلب ہے رام سنگھ کے کام کرنے کے طریقے سمجھا دوں اور اُس کو استعمال کرنے کا ہدایت نامہ وغیرہ بھی آپ کو دوں۔''

''ضرور ضرور۔'' پریم چوپڑا اُس سودے سے مطمئن لگ رہا تھا۔

''ہاں ایک اور ضروری بات میں آپ کو بتا دوں..... وہ یہ کہ دوسرے تمام روبوٹ کی طرح، اور روبوٹ سازی کے قائدے کے مطابق رام سنگھ کے اندر ایک خاص سسٹم (طریقہ) ہے۔ اس سسٹم کے تین اصول ہیں۔ روبوٹ اپنے مالک کا حکم مانے گا۔ روبوٹ انسانوں کو نقصان نہیں پہنچائے گا اور روبوٹ اپنے اوپر بھی کوئی خطرہ مول نہیں لے گا۔''

پریم چوپڑا نے پہلا اُصول سُن لیا، وہ اس سے بہت متاثر بھی ہوا۔ مگر اُس نے باقی دو اُصولوں پر دھیان نہیں دیا۔ اُس نے خوشی خوشی سر ہلایا اور سودے کے کاغذ اور ''روبوٹ کے غلط استعمال نہ کرنے'' کے معاہدے پر دستخط کر دیے۔ اُسے ایک نوکر ایک ''گُرگا'' مل گیا تھا۔

''اگر رام سنگھ 070 میرا روبوٹ دوکان سے کھانے پینے کا سامان خرید سکتا ہے تو پھر اور بڑھیا چیزیں جیسے ہیرے جواہرات، کیوں نہیں لاسکتا۔'' پریم چوپڑا نے سوچا۔

بازار میں اب روبوٹ بڑے بڑے پیکٹ اٹھائے، سنیما کے ٹکٹ خریدتے، کھانے پینے کا سامان اُٹھا کر کاروں میں رکھتے، عام طور پر نظر آتے تھے، مگر اب بھی لوگ ان حیرت انگیز نوکروں کو دلچسپی سے دیکھتے تھے۔ رام سنگھ 070 نہایت فرمانبردار تھا۔ وہ بہت تیزی اور صفائی سے کھانے پینے کی چیزیں اُٹھا کر سودار کھنے کی ٹرالی میں رکھتا اور پھر رُک کر اگلے حکم کا انتظار کرنے لگتا۔

''دو کلو آم پکّے اور رس بھرے۔'' پریم چوپڑا نے آموں کے بڑے سے ڈھیر کو دیکھ کر دور سے حکم دیا اور فوراً ہی رام سنگھ 070 نے بہترین آم چُن لیے۔

''کیش کاؤنٹر پر پیسے دے دو۔'' پریم چوپڑا نے ریموٹ کنٹرول کے اسپیکر میں کہا۔ رام سنگھ 070 رُکا، مُڑا اور بیچ کے راستے پر لوگوں کے درمیان بچتا بچاتا ایک تہذیب یافتہ شہری کی طرح جا کر لائن میں پیچھے کھڑا ہو کر اپنی باری کا انتظار کرنے لگا۔ پریم چوپڑا بازار کی چمک دمک کے مزے لینے لگا۔ وہ روبوٹ کی چستی پھرتی اور ہوشیاری سے بہت خوش تھا۔

رام سنگھ 070 وفادار کتے کی طرح پریم چوپڑا کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ پریم چوپڑا گوپال جیولرز کے سامنے جا کر رُکا۔ شیشے کی کھڑکی کے پیچھے سے اُس نے بہت سے سونے کے زیوروں کو دیکھا جو گاہکوں کو دکھانے کے لیے شوکیس میں لگائے گئے تھے۔ جھٹ پٹ پریم چوپڑا ایک کونے میں چھپ گیا اور ریموٹ کنٹرول میں جلدی جلدی مگر صاف صاف بولا۔ ''ایک بار اُٹھا کر چھپا لو۔ کوئی آواز نہیں کرنا اور یہ بات کسی کو بتانا نہیں۔ بہت راز کی بات ہے۔ ورنہ میں تمھارے سسٹم کا فیوز اُڑا دوں گا۔'' اُس نے دھمکی دی۔

رام سنگھ 070 دکان میں داخل ہو گیا۔ کاؤنٹر کے قریب گیا۔ اُس کی آہنی ہتھیلی آگے بڑھی اور ہار کسی قسم کے کھٹکے یا آہٹ کے بغیر اُس کے چیزیں رکھنے والے حصّے میں چلا گیا۔ کسی نے نہیں دیکھا۔ جوہری ایک گاہک سے بات کرنے میں مصروف تھا۔ پریم چوپڑا نے سارا ماجرا اپنی دوربین سے دیکھا۔ اُس نے اپنی پہلی کامیابی کی خوشی کا جشن منانے کے لیے سگریٹ میں ایک لمبا کش لگایا۔ رام سنگھ 070 باہر چلا گیا۔

شروع شروع میں قیمتی نوادرات، زیورات اور قیمتی پتھروں کی دکانوں پر یہ چوری بغیر کسی پریشانی کے چلتی رہی۔ کسی کو چور کا کوئی سُراغ نہیں ملا مگر رفتہ رفتہ دکان داروں کی گھبراہٹ اور پریشانی کافی بڑھ گئی۔ ان سب باتوں سے بے خبر پریم چوپڑا نے دکانیں لوٹنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ پر ایک دن ایک نوجوان پھل والے نے افغانی انگوروں کے ایک بہت قیمتی گچھے کو فولادی نیلے روبوٹ کے اندر غائب ہوتے دیکھ لیا۔ اس واقعے کی خبر تیزی سے چاروں طرف پھیل گئی۔ لوگوں نے جیسے ہی یہ خبر سُنی، تو کچھ دکان

داروں کو یاد آیا کہ جب اُن کے یہاں سے قیمتی چیزیں غائب ہوئی تھیں تو اُن کی دکان میں ایک نیلا روبوٹ موجود تھا۔ فوراً ہی یہ اطلاع پولس ہیڈ کوارٹر میں پہنچ گئی۔

ایک دن پریم چوپڑا رام سنگھ 070 کو قیمتی ہیرے چرانے کے لیے ''جھاویلی برادرس'' کی طرف لے کر گیا۔ پولس چوکس تھی، کمپیوٹر کی مدد سے کام کرنے والے کیمروں نے، جو پل پل کی رکارڈنگ کر سکتے تھے، رنگے ہاتھوں اُس کی تصویریں اُتار لیں۔ رام سنگھ روبوٹ پکڑا گیا مگر اپنی دور بین کی مدد سے جیسے ہی پریم چوپڑا نے یہ دیکھا، وہ فوراً بھاگ گیا۔ دو لوگوں نے رام سنگھ کے فولادی گلے پر لکھا لائسنس نمبر نوٹ کر لیا۔

پریم چوپڑا کو اُس کے گھر سے گرفتار کر لیا گیا۔ کیونکہ وہ رام سنگھ 070 چور کا مالک تھا۔

اپنی گرفتاری کے فوراً بعد پریم چوپڑا کو عدالت میں مقدمہ شروع ہونے تک ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ چوری کا کوئی سامان اُس کے پاس سے برآمد نہیں ہوا۔

اُس نے اپنے گروہ کے ذریعے سامان کو چالاکی کے ساتھ ٹھکانے لگا دیا تھا۔ عدالت میں اُس نے سارے الزامات قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

''لگتا ہے کسی نے رام سنگھ 070 کے پروگراموں میں کچھ چھیڑ چھاڑ کی ہے۔ پولس کو میں اپنے گھر میں ملا تھا۔'' اُس نے بحث کی۔

''پہلی بات تو یہ کہ تم نے روبوٹ کیوں خریدا تھا؟'' سرکاری وکیل گویل نے پوچھا۔

''گھر کے کاموں میں مدد کے لیے۔''

''یقیناً اُس کو چلنے پھرنے، کام کرنے کی ہدایتیں تم ہی دے سکتے تھے۔''

''بالکل۔ مگر میں اُس کے پروگراموں میں تبدیلی نہیں کر سکتا تھا۔ شاید سُپر روبوٹ پلازا میں کوئی رام سنگھ 070 کو کنٹرول کر رہا تھا۔ میں کمپیوٹر کا ماہر نہیں ہوں یور آنر۔'' پریم چوپڑا نے اینٹھ کر کہا۔

وکیل گویل نے گلا صاف کیا اور جج کے قریب گئے۔ ''مسٹر چوپڑا کے بیان کو نظر میں رکھتے ہوئے اور پچھلے کچھ دن کے واقعات کی بنا پر جس میں بہت سے جوہری اور نوادرات کے بیوپاریوں کا نقصان ہوا ہے، یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ رام سنگھ روبوٹ کی حرکتوں پر نظر ڈالی جائے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ تمام وارداتیں رام سنگھ کو خریدے جانے کے بعد ہوئی ہیں۔ رام سنگھ کی یادداشت (میموری) کا ٹیپ ساری ضروری معلومات سے پردہ اُٹھا دے گا۔ میں عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ رام سنگھ روبوٹ کو عدالت میں بلایا جائے۔''

پریم چوپڑا کو جھٹکا لگا۔ یہ بات تو اُس نے سوچی ہی نہیں تھی۔ ''روبوٹ عدالت میں حاضر'' اگلے دن اخباروں کی سرخیاں تھیں۔ لوگوں نے پہلے کبھی ایسا نہیں سُنا تھا۔ وہ سب حیرت سے سوچ رہے تھے کہ بھلا روبوٹ کیا ثبوت پیش کرے گا، کیسی معلومات

سے پردہ اُٹھائے گا۔

اگلے دن عدالت لوگوں سے کھچا کھچ بھری تھی۔ لوگ روبوٹ کو گواہوں کے کٹہرے میں کھڑا دیکھنے کے لیے بے تاب تھے۔ وکیل گویل آخری وقت تک اپنی بحث کے نکتوں پر غور کرتے رہے، وہ بہت پُر اعتماد اور چاق چوبند لگ رہے تھے مگر پریم چوپڑا کو بھی اتنا ہی بھروسہ اور یقین تھا۔ یہ مشینی آدمی کبھی بھی اپنے مالک سے دغا نہیں کرسکتا۔ عدالت کی کارروائی شروع ہوئی۔ رام سنگھ 070 گواہوں کے کٹہرے میں آکر کھڑا ہوگیا۔

''یور آنر'' وکیل گویل نے شروعات کی، ''مجھے سُپر روبوٹ کمپنی نے بتایا ہے کہ اس قسم کے روبوٹ کی میموری کے ٹیپ میں گزرے ہوئے ہفتے کی ساری معلومات ہوتی ہے۔''

''مگر مقدمہ تو واردات کے پندرہ دن بعد شروع ہوا ہے۔ اس کا مطلب ضروری معلومات تو صاف ہوگئی ہوں گی!'' جج نے کہا۔ وکیل گویل ہلکے سے مُسکرائے، پریم چوپڑا کی طرف گھور کر دیکھا اور کہا۔ ''جناب، تب سے اب تک روبوٹ بند کرکے رکھا گیا ہے۔ اُس نے کوئی کام نہیں کیا ہے۔''

''پریم چوپڑا کا منہ لٹک گیا مگر اُسے یقین تھا کہ رام سنگھ 070 اپنے مالک کا حکم مانے گا۔ اُس کا راز راز ہی رہے گا۔

''بحث جاری رکھیں۔'' جج نے حکم دیا۔

وکیل گویل رام سنگھ روبوٹ کی طرف مڑے۔ ''تمھارا مالک کون ہے؟'' انھوں نے چھوٹا سا سوال کیا۔ ایک گہری نیلی روشنی جلی اور تھوڑی دیر گھر گھر کی آواز کے بعد روبوٹ اپنی مشینی آواز میں چیخ کر بولا۔ ''مسٹر پریم چوپرا۔''

''تم نے پریم چوپڑا کے لیے کیا کام کیے تھے؟''

ذرا سی دیر خاموشی رہی۔ پھر گھر گھر کی آواز آئی اور پھر جواب ملا۔ ''صفائی کی، لان کی گھاس کاٹی، کپڑے دھوئے، برتن صاف کیے، بازار سے سامان لایا.....''

''پچھلے چھ دن کے کاموں کو تفصیل سے یاد کرو۔'' وکیل گویل نے بیچ میں ٹوکا۔ یادداشت کا ٹیپ میکانکی طور پر مشینی انداز میں شروع ہوگیا۔ ''کار کی ڈکی کھولی۔ بازار سے لایا ہوا کھانے پینے کا سامان رکھا۔ ڈکی بند کی، مُڑا، تیس قدم چلا، رُکا، نوادرات کی دکان بائیں ہاتھ پر تھی۔

ہدایت سگنل.....ٹیپ خالی ہے..... بائیں طرف چلا، مڑا، بیس قدم چلا.....'' اس موقعے پر وکیل نے ٹوک دیا۔ ''رُکو، پیچھے جاؤ اور پھر سے ٹیپ چلاؤ۔'' دوبارہ ہدایت کے سگنل کے بعد صاف وقفہ محسوس ہوتا تھا۔

وکیل گویل نے ٹیپ بند کردیا۔ ''اُس وقفے پر غور کیجیے، یور آنر کوئی ایسا کام ہے جس کا اظہار نہیں کیا گیا، یہاں کون سی ہدایتیں تھیں؟ وہ ہدایتیں کس نے دی تھیں؟'' انھوں نے رام سنگھ 070 سے پوچھا۔

''ان معلومات کا اظہار نہیں کیا جاسکتا۔'' اُس نے جواب دیا۔

''پر کیوں؟''

''روبوٹ اپنے مالک کے حکم کے خلاف کام نہیں کرتے۔''

وکیل گویل نے اچٹتی نظروں سے پریم چوپڑا کو دیکھا جو ملزموں کے کٹہرے میں بے چین ہو رہا تھا۔ ''یور آنر وکیل نے جج کو مخاطب کیا،'' وہ خاص ہدایتیں پریم چوپڑا نے دی تھیں۔ اُن کا منظرِ عام پر آنا ضروری ہے۔ کیونکہ نوادرات کی دکان کے ملازموں کے مطابق یہ وہی تاریخ اور دن ہے جس وقت گنپتی کی قدیم اور قیمتی مورتی چُرائی گئی تھی۔''

''یہ ثبوت چوری کی واردات کی طرف اشارہ تو ضرور کرتا ہے مگر مجھے افسوس ہے کہ اُس کی بنیاد پر سزا نہیں دی جا سکتی۔'' جج نے کہا۔

وکیل گویل فکر میں ڈوب گئے۔ تبھی انھیں روبوٹ سازی کے تین اُصول یاد آئے۔ وہ رام سنگھ 070 کی طرف نئے جوش کے ساتھ مڑے۔

''رام سنگھ وہ ہدایتیں کیا تھیں؟'' انھوں نے نرمی سے پوچھا۔

''ان معلومات کا اظہار نہیں کیا جا سکتا۔''

''اگر یہ ہدایتیں سامنے نہیں لائی گئیں تو اُن بہت سے لوگوں کو دُکھ پہنچے گا جن کا سامان چوری ہوا ہے۔'' وہ ہدایتیں کیا تھیں۔'' وکیل گویل نے بات کو بڑھاتے ہوئے کہا۔

''روبوٹ لوگوں کو تکلیف نہیں پہنچاتے۔'' رام سنگھ 070 نے مشینی انداز میں جواب دیا۔

''رام سنگھ تمھیں ہدایتوں کو یاد رکھنا ہے۔'' پریم چوپڑا نے کہا۔

''برائے مہربانی خاموش رہیے۔'' وکیل گویل نے جھلا کر پریم چوپڑا کو دیکھا۔ ''وہ ہدایتیں کیا تھیں؟'' انھوں نے زور دے کر پوچھا۔

''ان معلومات کا اظہار نہیں کیا جا سکتا'' رام سنگھ 070 نے ٹیپ رکارڈ کی طرح دوہرا دیا۔

''تم سمجھتے کیوں نہیں، رام سنگھ 070 وہ تمام لوگ جن کی چیزیں کھوئی ہیں اُن کا نقصان ہوگا..... مالی نقصان۔ اُن کو دُکھ پہنچے گا۔'' وکیل گویل نے اپنی آواز اونچی کر لی۔ ''اب بتا دو وہ ہدایتیں کیا تھیں؟''

رام سنگھ 070 کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔

''بہت سے، بہت سارے لوگوں کو پریشانی ہوگی۔ بولو، بولو، رام سنگھ 070۔'' وکیل گویل نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

''نہیں رام سنگھ، نہیں۔'' پریم چوپڑا گھبرا کر چلایا۔ مگر جج نے اُسے ڈانٹا ''خاموش۔''

''بولو رام سنگھ 070۔'' جج نے کہا۔ رام سنگھ 070 نے جھٹکے سے سر بائیں طرف موڑا پھر فوراً ہی جھٹکے سے دائیں طرف سر موڑ کر جج کو دیکھا۔

جواب دینے والی مشین کے سگنل یکا یک بند ہوگئے۔ گھر گھر کھٹ کھٹ کی آوازیں آئیں جیسے رام سنگھ 070 میں کچھ ٹوٹ رہا ہو۔ ہلکی نیلی روشنی کا رنگ کچھ بیگنی سا ہوگیا۔

National Council for Promotion of Urdu
ACC No. 5170/F3
15/10/05
New Delhi

''ان معلومات کے نہ ملنے سے بہت سے لوگوں کو دُکھ پہنچے گا۔ بتا دو رام سنگھ 070 بتا دو۔'' وکیل گویل نے پھر اپنی بات دہرائی۔

کلِک کی ایک آواز آئی جس سے پتا چلتا تھا کہ چلتا ہوا ٹیپ اٹک گیا ہے اور سگنل جام ہوگئے ہیں...... بیپ۔بیپ۔بیپ۔بیپ۔ کھڑ کھڑ کی آوازیں اور بیگنی روشنی تیز ہوگئی۔ رام سنگھ روبوٹ کے ماتھے پر ایک لال روشنی جل اُٹھی جس کا مطلب تھا خطرہ۔ جواب دینے والا سسٹم ناکارہ ہوگیا۔ اُس کے سینے کے بیچوں بیچ چھوٹے چھوٹے شٹر کھلے اور ایک چھوٹے سے T.V. اسکرین پر لکھا ہوا دکھائی دیا ''سسٹم بیکار ہوگیا ہے'' رام سنگھ روبوٹ کا فیوز اڑ گیا۔ ''ارے نہیں! نہیں!'' سُپر روبوٹ کمپنی کا سیلز مین چلّایا۔ ''اس کا فیوز اڑ گیا یہ مر گیا۔'' وہ گواہوں کے کٹہرے میں آکر آہستہ سے بولا۔

عدالت میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ جج، وکیل، پریم چوپڑا اور عدالت میں آئے ہوئے لوگ حیرت سے جیسے بُت بن گئے تھے۔ سب کو بے حد افسوس بھی تھا۔ سُپر روبوٹ کمپنی کے دو میکنک بے جان رام سنگھ 070 کو اُٹھا کر عدالت سے باہر لے گئے۔ بھرّائی ہوئی آواز میں سیلز مین نے سمجھایا ''اس کے اندر ڈالی گئی ہدایتوں کا آپس میں ٹکراؤ ہو رہا تھا، کشمکش ہو رہی تھی۔ اُس نے اپنے اُصولوں کے لیے اپنی قربانی دے دی......'' سیلز مین اپنے آدمیوں کے پیچھے پیچھے باہر چلا گیا۔

عدالت میں بہت دیر تک خاموشی رہی۔ وکیل گویل نے گلا صاف کیا اور سکوت توڑا، ''روبوٹ لوگوں کو نقصان نہیں پہنچاتے اور وہ اپنے مالک کی نافرمانی بھی نہیں کرتے۔ مسٹر پریم چوپڑا کی اُن ہدایتوں کا اُسے اظہار بھی نہیں کرنا تھا، مگر اُن کی وجہ سے خود اُس کے وجود کو بھی خطرہ ہوسکتا تھا۔ ایک روبوٹ کی زندگی کے لیے خطرہ تھیں وہ۔ اگر وہ اُن کے بارے میں بتا دیتا تو اپنے مالک کی نافرمانی کرتا، اگر نہ بتاتا تو دوسروں کو نقصان ہوتا۔ اس کشمکش نے رام سنگھ کا خاتمہ کر دیا۔ اُس نے جھوٹ بول کر انسانوں کو دُکھ پہنچانے کے بدلے خود ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا قبول کر لیا۔ وہ اپنے مالک سے دغابازی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔'' وکیل گویل کے چہرے پر اُداسی اور دُکھ کے اثرات نظر آرہے تھے۔ انھوں نے اپنی فائلیں اٹھائیں اور جج کے سامنے ذرا سا جھک کر عدالت سے چلے گئے۔

عدالت کی کارروائی جاری رہی۔ پریم چوپڑا کا جرم ثابت ہوگیا اور اُسے سزا ہوئی۔

□□□

6 تا 14 ستمبر 2003 کو سرینگر میں منعقدہ چوتھے کل ہند اردو کتاب میلے کے دوران ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی کے زیر اہتمام "کشمیری نثر کا ارتقا" پر سمینار کا انعقاد ہوا۔ اس موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب جلیس احمد خاں ترین۔ تصویر میں جناب رحمان راہی اور پروفیسر محمد زماں آزردہ کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

دریا گنج میں، بچوں کے گھر میں قائم قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر میں 3 اکتوبر کو جلسۂ تقسیم اسناد منعقد ہوا۔ اس موقعے پر (دائیں سے) وزیر اعلا دہلی، محترمہ شیلا دکشت، قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ اور ڈپلوما کورس میں پہلی پوزیشن حاصل کرنے والا طالب علم محمد اسد خاں۔

RNI No. 70323/99 DL-15052 / 2003-5

URDU DUNIYA Monthly, December 2003, Vol. 5, Issue: 12

National Council for Promotion of Urdu Language

Department of Secondary & Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India, New Delhi

قومی اردو کونسل این سی ای آر ٹی کی شائع کردہ درسی کتب اردو داں طلبہ کو ان کی مادری زبان میں ترجمہ کرا کے فراہم کراتی رہی ہے۔ این سی ای آر ٹی کی معاون درسی کتب کا ترجمہ بھی قومی اردو کونسل نے کرایا ہے۔ اس سلسلے کی درج ذیل آٹھ کتابیں حال ہی میں شائع ہوئی ہیں۔

جراثیم

مصنف: سی۔وی۔ سبرامنین/مترجم: شریف احمد خاں

جراثیم کرۂ ارض پر پائے جانے والے مختلف النوع جانداروں میں بے حد اہم ہیں۔ یہ مفید بھی ہیں اور مضر بھی۔ زندگی اور موت، صحت اور مرض ہر حالت میں جراثیم ہماری زندگی کا اہم جزو ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں جراثیم سے متعلق تفصیلی معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔

صفحات: 129، قیمت: -/36 روپے

چٹانیں بولتی ہیں

مصنف: وشنو مترا/مترجم: انوار رضوی

چٹانیں ہماری کائنات کا اہم حصہ ہیں۔ اس کتاب میں زمین کی ابتدا اور ارتقا کے مختلف پہلوؤں سے متعلق بعض ایسے حقائق بیان کیے گئے ہیں جن کا انکشاف چٹانوں کے ذریعے ہوا ہے۔ طالب علموں کی آسانی کے لیے متعدد خاکے اور تصاویر بھی شامل کتاب ہیں۔

صفحات: 65، قیمت: -/21 روپے

تیز تر اور دور تر (نقل و حمل کی کہانی)

مصنف: میر نجابت علی/مترجم: مہ جبیں اختر

نقل و حمل انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ پیٹ بھرنے سے لے کر مختلف افراد سے ملنے اور دیگر ضروریات کے تحت ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا انسان کا شوق بھی ہے اور مجبوری بھی۔ زیرِ نظر کتاب میں ذرائع نقل و حمل کے مسلسل ارتقائی سفر سے واقف کرایا گیا ہے۔

صفحات: 82، قیمت: 28 روپے

جنگلات کی کاشت

مصنف: ایس۔ کونداس/مترجم: مسرت جہاں

جنگل ہمارے لیے بے حد ضروری ہیں۔ جنگل ہمیں پہاڑ اور دیگر قدرتی شے ... یہ نہ صرف ماحولیاتی توازن برقرار رکھنے میں معاون ہیں بلکہ ... صنعتوں کا دار و مدار بھی ان پر ہے۔ اس کتاب میں مختلف جنگلی درختوں اور جنگل سے متعلق مختلف پہلوؤں سے واقف کرایا گیا ہے۔

صفحات: 95، قیمت: -/24 روپے

بہادری کے کارنامے

مصنف: منوج داس/مترجم: ایس۔ ایم۔ احمد

ہمارے ملک کو انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے لاتعداد قربانیاں دینی پڑی ہیں۔ جن سورماؤں نے اپنی جان آزادیِ وطن کے لیے نچھاور کی، ان کی ایک طویل فہرست ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں جدوجہد آزادی کے ابتدائی دور کے ایسے ہی بہادر سپوتوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

صفحات: 83، قیمت: -/25 روپے

رام پرشاد بسمل کی آپ بیتی

مرتب: ڈاکٹر وشوامترا اپادھیائے/مترجم: احسان احمد صدیقی

مادرِ وطن کی آزادی کے لیے اپنی جان کی قربانی پیش کرنے والوں میں مشہور انقلابی رام پرشاد بسمل سرِ فہرست ہیں۔ یہ آپ بیتی انھوں نے گورکھپور جیل میں اپنی پھانسی سے دو دن پہلے لکھی تھی۔ جدوجہد آزادی کے اس دور کی حقیقی تصویر کشی کے سبب یہ آپ بیتی تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔

صفحات: 109، قیمت: -/33 روپے

سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں

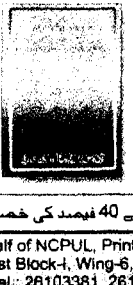

مصنف: راجندر اوستھی/مترجم: عبدالغفار خاں

خان عبدالغفار خاں کی زندگی طوفانوں کی تاریخ ہے۔ ہندوستان کی جنگ آزادی سے لے کر پاکستان کے قیام کے بعد تک وہ پختونوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف غریبوں اور مظلوموں کی لڑائی لڑتے رہے اور اس لڑائی میں ان کی زندگی کا بیشتر حصہ جیل میں گزرا۔ سرحدی گاندھی کے حالاتِ زندگی سے واقفیت کے لیے اس کتاب کا مطالعہ کریں۔

صفحات: 78، قیمت: -/21 روپے

تین زنگ نورگے

مصنف: درگا پرشاد شکل/مترجم: جہاں آرا

تین زنگ نورگے اور ایڈمنڈ ہلیری کی کوہ پیمائی کی تاریخ کے روشن باب ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں تین زنگ نورگے کی سوانح حیات کے ساتھ ساتھ ایورسٹ کی چوٹی سر کرنے کی مہم کی پوری تفصیل درج ہے۔ طلبہ کے لیے ایک بے حد معلوماتی کتاب۔

صفحات: 87، قیمت: -/21 روپے

نوٹ -: طالب علموں اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

Printed and Published by Director, NCPUL on behalf of NCPUL, Printed at J.K. Offset Printers, Jama Masjid, Delhi-110006 and Published at NCPUL, West Block-I, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110 066, Editor Dr. M. Hamidullah Bhat. Tel.: 26103381, 26103938